

عشق لا

فریال سید

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔

[www.pakistanipoint.com](http://www.pakistanipoint.com)

# عشق لا

فریال سید



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔

[www.pakistanipoint.com](http://www.pakistanipoint.com)

# عشقِ ارا

## کتابی شکل: پاکستانی پوائنٹ کمپوزنگ ٹیم



پاکستانی پوائنٹ کوئی تجارتی ویب سائٹ نہیں ہے یہاں پر موجود ناولز بالکل مفت ہیں۔ اس مشن کا مقصد صرف اردو ادب کی خدمت کرنا ہے تاکہ جو لوگ وطن سے دور ہیں اور اردو کتب حاصل نہیں کر سکتے، وہ یہاں سے ڈاؤنلوڈ کر لیں۔ اگر آپ اردو لکھنا جانتے ہیں تو آپ بھی روز کا ایک صفحہ کمپوز کر کے اس مشن کا حصہ بن سکتے ہیں۔ مزید معلومات کے لئے، سپر موڈز: صبا گل، تلی، ٹیم لیڈر: ایم وائے صائم، میمنجنت: حبیب یاد قار سے رابطہ کریں، شکریہ



## انتساب!

ہر ذی روح کی پہلی محبت کے نام

بادلوں سے اوپر، آسمان اتنا نزدیک ہو کے بھی خاصا دور تھا۔ نیلا آسمان پوری کائنات میں خدا کی بنائی گئی ان گنت حسین نعمتوں سے بڑھ کے پسند تھا۔ پتا نہیں کیا تھا پر اسے اپنا اور آسمان کا تعلق گہرا لگتا تھا خواہ وہ راتوں کو کالی آسمان کی چادر پہ ٹٹکے ڈھیروں ننھے منے تاروں کو تکتا ہو یا صبح سویرے طلوع ہوتے سورج کو دیکھنا۔ دن کو نکھرے ہوئے نیلے آسمان پہ سفید روئی کے گالوں کا سنہرے سورج کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنا ہو یا شام کو ڈھیروں رنگ آسمان پہ بکھیرتا غروب آفتاب کا منظر۔

بس اسے پتا تھا، تو صرف یہ کہ اسے آسمان سے عشق تھا۔

”خواتین و حضرات اپنے حفاظتی بند باندھ لیجیے ہم کچھ ہی دیر میں کراچی ایئر پورٹ لینڈ کرنے والے ہیں شکریہ۔“

وہ ایک دم چونکی۔ خیالوں کا غلبہ اور آسمان کو اتنے قریب سے دیکھنے کا احساس ہی اتنا ہوش اُڑا دینے والا تھا کہ وہ کھو سی گئی تھی۔



نسوانی آواز اب ہدایات انگریزی میں دہرا رہی تھی۔

اپنے بابا اماں اور لالا سے کچھ ہی دیر میں ملنے کے خیال نے اسے سکون سا دیا تھا۔  
ہیزل برائون آنکھیں طمانیت سے موند کے عائکہ سید نے اپنا سر سیٹ کی بشت سے  
لگا لیا۔

کچھ دیر متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اسے لالا کا چہرہ نظر آ ہی گیا۔  
- آج پھر اسے ایئر پورٹ سے لینے صرف لالا ہی آئے تھے۔

اس نے ٹھنڈی آہ بھر کے اپنی چادر ٹھیک کی اور دور کھڑے لالا کی طرف بڑھ گئی۔ وہ کالا چشمہ ہاتھ میں پکڑے جھنجھلائے ہوئے انداز میں اسے ہی ڈھونڈھ رہے تھے۔ لالا نے اسے اپنی طرف آتا دیکھ کے خیر مقدمی مسکراہٹ کے ساتھ جوش سے اس کی طرف ہاتھ ہلایا۔

بڑے بھائی کی محبت پہ وہ مُسکرائی۔ ان کے قریب جا کے ہلکا سا سر کو خم دیا تھا تا کہ لالا سر پہ ہاتھ رکھ سکیں۔

”السلام و علیکم لالا۔“

اس کے سر پہ نہایت نرمی سے ہاتھ رکھتے لالا نے جوش سے جواب دیا:  
 ”وعلیکم السلام گودی“!



”گودی“ فارسی ، بلوچی اور براہوی میں شہزادی کو کہا جاتا ہے۔ بلوچستان میں یہ لفظ خواتین کو عزت دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عائکہ کو اس کے دادا گودی کہتے تھے۔ اب رفتہ رفتہ وہ سب کی گودی بن چکی تھی۔

”کیسی ہو؟ سفر کیسا رہا؟ کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟ کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں؟“

”چلیں؟“

تھکاوٹ سے چور لہجے میں عائلہ نے پوچھا، تو معید سید نے اثبات میں سر ہلا دیا۔  
گاڑی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے آخر عائلہ پوچھ بیٹھی: ”بابا آج پھر نہیں آئے  
“

معید کے قدم تھوڑے ٹھٹکے پر وہ بولا تو لہجہ بالکل عام سا تھا: ”پگلی! پتا تو ہے تمہیں بابا کتنے مصروف ہوتے ہیں اور دیکھو تمہارا بینڈ سم لالا خود آیا ہے۔ کیا یہ کافی نہیں؟“





عائلہ کو ان کی مُسکراہٹ مصنوعی لگی۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ نہ ہوتا، تو وہ کبھی اس سے جھوٹ نہ کہہ پاتے۔ وہ بھائی کی آنکھیں پڑھنے میں ماہر تھی پر اب احساس ہوا کہ وہ ہونٹ بھی پڑھ سکتی ہے۔  
لالا کا دل رکھنے کو عائلہ بھی مُسکرا دی:

”آپ اکیلے کہاں آئے ہو پورا کانوائے ساتھ لائے ہو۔“  
مصنوعی غصہ چہرے پہ سجاتے، عائلہ نے اپنی چھوٹی سی ناک چڑھائی تھی۔  
معید سید کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

وہ بچپن سے اپنی بہن کی عادت سے واقف تھا۔ اسے اپنی گاڑی کے پیچھے بندو قیں اٹھائے گاڑڈز کی گاڑیاں زہر لگتی تھیں۔ وہ کبھی انہیں کانوائے بلاتی تو کبھی بابا کی فوج۔

وہ سوچے جا رہا تھا اور اپنے سامنے کھڑی 20 سالہ اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو اس کے لیے آج بھی وہی عائلہ تھی، چھوٹی سی معصوم عائلہ جس کی ناک کھینچ کے اکثر وہ اپنی محبت کا اظہار کرتا تھا۔ کوئی کچھ بھی بولے وہ جانتا تھا اس کی عائلہ اس کی گودی کبھی اس کی یا اس کے بابا میر ابراہیم سید کی عزت پہ آنچ نہیں آنے دے سکتی۔





و فراست کے چرچے آج بھی تاریخ کے اوراق پہ رقم ہیں۔ وہ دو مشہور کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ”منہاج العارفین“ اور ”خلاست الشریعہ“ خواجہ ولیوں کے حلقے میں بلند مقام رکھتے تھے۔ وہ عاشقِ رسول ﷺ اور اسلام کے سچے طالبِ علم تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خواجہ مودودی چشتی جب حضرت خواجہ ناصر ابو یوسف بن سمان چشتی کے مرید بنے تو ان کے مرشد نے ان سے کہا تھا:

”اے قطب الدین مودودی فقر کو اپنالو۔“

کہا جاتا ہے کہ اپنے مرشد کا اشارہ سمجھتے ہوئے انہوں نے فقر کو ایسے اپنایا کہ خدا کی محبت سے مالا مال ہو گئے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے 20 سال دنیاوی زندگی سے دور ایک بیابان میں ذکرِ الہی کرتے گزار دیے۔ مشہور مورخوں کی کئی تحریروں میں شواہد موجود ہیں کہ خواجہ نے ان 20 سالوں میں دو قرآن پاک دن میں دو قرآن پاک رات میں مکمل کیے ہیں۔ تاریخ یہ بھی لکھتی ہے کہ خواجہ کی زبان پہ کلمہ طیبہ کے ورد کے علاوہ صرف قرآن پاک کی تلاوت ہی رہی۔ کھانا پینا براہِ نام تھا۔ انہوں نے 7 سال کی عمر میں ہی قرآن پاک اپنے والد صاحب کی راہنمائی سے حفظ کر لیا تھا۔ یہ ان کی اسلام سے محبت ہی تھی جو اللہ پاک نے انہیں وہ عروج بخشا کہ مولانا زکریا نے انہیں ”کش قلوب“ اور ”کشفِ قبور“ کہا۔ کہتے ہیں کہ



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔

[www.pakistanipoint.com](http://www.pakistanipoint.com)

یہ کلی سادات کرانی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے اور ان کی فارسی اور ثقافت کو ان کی اولاد زندہ رکھے ہوئے ہے۔

سب سے پہلے ان کا مزار مٹی سے بنایا گیا تھا، جس کے اطراف میں 1970ء میں سادات کرانی نے اینٹوں کی دیوار بنا کے احاطہ کر دیا تھا پھر 1973ء میں اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے خود نوٹس لیتے ہوئے ایک عالی شان مزار تعمیر کروانے کا حکم دیا جس میں پھر وقتاً فوقتاً سادات خود مزید تبدیلیاں کرواتے رہے۔ 2008ء میں بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر وزیر اعلیٰ بلوچستان اسلم ریسانی نے خواجہ بابا کے مزار کے اطراف میں پھیلے سادات کے 600 سال قدیم قبرستان کی حفاظت کے لیے مضبوط احاطہ بنوانے کا اعلان کیا۔

ریسانی قبیلہ بھی دیگر کئی قبیلوں کی طرح خواجہ ولی بابا کے مرید ہونے پہ فخر محسوس کرتا تھا۔

خواجہ بابا کے مزار میں بہت سی تبدیلیاں ہوتی رہیں، مگر آج اگر مغربی بانی پاس سے گزرتے ہوئے ایک بہت ہی خوبصورت مزار دن میں سنہری گنبد کے ساتھ اور رات میں بے پناہ ننھے منے برقی قہقروں کے بیچ چمکتا دکھائی دے، تو یہ ہی خواجہ ولی بابا مودودی چشتی کا مزار ہے اور یہ ہی کلی سادات کرانی ہے۔







”ارے! بھئی کوئی مجھے کھانا وانا بھی پوچھے گا یا ماں بیٹی یہیں ساری باتیں کریں گی۔“

معصوم سی شکل بناتا معید سید، ابھی تک انہیں لان میں کھڑا پا کے بولا تھا۔  
”چلو چلو! کھانا تیار ہے بس تم دونوں منہ ہاتھ دھو لو۔“

پیار سے سکینہ صاحبہ نے اپنے اکلوتے سپوت کو دیکھا۔ سنہرا رنگ گرمی کی حدت سے قدرے گلابی ہو رہا تھا۔ 6 فٹ سے نکلتا قد، ڈارک برائون گھنے بکھرے ہوئے بال، شہد جیسی آنکھیں اور سفید کاٹن کا سوٹ جس کی سلوٹیں معید سید کی تھکاوٹ کی گواہی دے رہی تھیں۔ انہوں نے نظر لگ جانے کے ڈر سے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کے اس پہ پھونکا تھا۔

جواب میں معید نے ان کے گرد اپنے بازو پھیلا کے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ان کے پیچھے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی عائلہ نے پر سوچ نگاہیں بابا کے کمرے کی کھڑکی پہ جمائی تھیں۔

”بابا! میرے اچھے بابا۔ کب تک یونہی ناراض رہیں گے اپنی عائلہ سے۔“  
دل ہی دل میں خود سے کہتی عائلہ کی آنکھوں سے کچھ آنسو ٹپک کے اس کی کالی بلوچی کڑھائی والی چادر میں جذب ہو گئے۔





کالی چادر اوڑھے، کالے ہی سادہ سے ملگجے جوڑے میں ملبوس، پیروں میں سادہ سی کالی چپل پہنے، پھیکے پڑتے رنگت والی، بکھری بکھری سی وہ لڑکی، کہیں سے عائلہ نہیں لگ رہی تھی۔

عائلہ تو اتنی خوش پوش تھی کہ لوگ اس کے کپڑوں کو ہی دیکھ کے اس کے بہترین ذوق کا اندازہ لگا لیتے تھے۔ اس کو ڈیزائننگ کا شوق تھا اپنے کپڑے زیادہ تر وہ خود ہی ڈیزائن کرتی تھی۔

”بابا! میں عام لڑکیوں کی طرح ہی سوچتی ہوں، میں پڑھنا چاہتی ہوں بابا، مجھے شانزے، شازمینہ یا علیرے نہیں بننا۔ پلیز بابا سمجھیں نا۔“

عائلہ کی آواز اُن کے کانوں میں گونجی تھی۔ کچھ دھندلے سے منظر بھی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔

”پر بچہ! تم نے نوکری تھوڑی کرنی ہے؟ ان کی طرح میٹرک کرو گھر بیٹھو۔“

عائلہ کو پیار سے سمجھانے کی ان کی یہ کوشش تب ناکام ہوئی، جب عائلہ بولی:

”پر بابا آپ نے وعدہ کیا تھا جب آپ ہمیں کراچی لائے تھے کہ آپ مجھے پڑھائیں گے اور لالا بھی تو پڑھ رہے ہیں۔ میں بھی انہی کے کالج میں داخلہ لے لوں گی بس!“



”عائلہ! کہاں ہو بھئی۔“

معید کی آواز پہ ماضی کا وہ منظر میرا ابراہیم سید کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سامنے لان میں کھڑی عائِلہ انہی کی کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی پہ یک طرفہ کانچ ہونے کی وجہ سے عائِلہ انہیں نہیں دیکھ سکتی تھی، مگر وہ عائِلہ کو دیکھ سکتے تھے۔ عائِلہ کی آنکھوں سے آج بھی دو آنسو گرے تھے۔ پر آج ان کا دل موم نہ ہوا تھا۔ عائِلہ کاش دو سال پہلے تم نے وہ سب نہ کیا ہوتا، کاش تم میری عزت کا خیال کر لیتی، کاش سوچتی تم عام لڑکی نہیں ہو تم سید زادی ہو، تو آج یہ کرب تمہاری اور میری تقدیر نا ہو تا۔ کاش! کاش! عائِلہ کاش!

پر تم نے کچھ ناسوچا اور میرا بھروسہ توڑ ڈالا۔ اب تم اسی لائق ہو کہ بھگتو، تم ایسے ہی اپنے بابا کے لیے تڑپو۔ میں نے تمہیں اپنا اعتبار، بھروسہ، پیار، سب دیا بدلے میں تم نے کیا دیا؟

دھوکا؟

”دھوکا؟“

نہیں میں نے کوئی دھوکا نہیں دیا۔ میں بے قصور ہوں ، میں نے کچھ نہیں کیا۔ بابا میرا اعتبار کریں پلیز میری بات تو سن لیں۔“

جواب میں بابا نے ایک زناٹے دار تھپڑ عائلہ کے آنسوؤں سے تر چہرے پہ رسید کیا تھا۔

عائلہ سن رہ گئی، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے بابا کو دیکھتے، وہ اب بھی بولنا چاہتی تھی، اپنی صفائی دینا چاہتی تھی، پر اس کے ہونٹ نہیں ہل رہے تھے، اس نے کوشش کی اماں کو دیکھ سکے، لالا کو دیکھے ان کی آنکھوں میں اپنے لیے اعتبار ڈھونڈے پر اس کی آنکھیں بھی نہیں ہل پا رہی تھیں۔ بابا کے چہرے کی سختی اور نفرت پہ گڑھ سی گئی تھیں۔ اسے اپنے دماغ میں دھماکے سے محسوس ہوئے، کانوں میں آتش فشاں پھٹنے کی آوازیں۔ وہ اپنے کانوں کو دونوں ہاتھوں سے بند کر لینا چاہتی تھی، وہ سب کو بتانا چاہتی تھی کہ اس کا سر پھٹ رہا ہے پر اس کے لب خاموش تھے، آنکھیں خشک تھیں، جسم بے جان تھا۔ کپڑے کی گٹھڑی کی طرح اس کا وجود اس بڑے سے لالونج کے سفید چمکتے سنگ مرمر کے فرش پہ پڑا تھا۔ اسے پہلی دفع نفرت کا مطلب پتا چلا تھا، دھتکارے جانے کی تکلیف محسوس ہوئی تھی۔ بے اعتباری کا دار اتنا کاری تھا کہ وہ سہ ناپا رہی تھی پر بے بس تھی سہے جا رہی تھی







وہ شش و پنج میں مبتلا تھی کہ اس کے ہاتھ کی پشت پہ اسے کچھ نم سا گرتا محسوس ہوا۔ وہ آنکھیں کھولنا چاہتی تھی، اپنا ہاتھ ہلانا چاہتی تھی، اسے کسی کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں، وہ اماں تھیں شاید، پر وہ کیوں رو رہی تھیں؟

عائلہ حیران تھی، وہ انہیں بتانا چاہتی تھی وہ ٹھیک ہے، رونے کی ضرورت نہیں، مگر وہ لاکھ کوشش کے باوجود ایک انگلی تک نہیں ہلا پا رہی تھی۔

اماں رو رہی تھیں ساتھ میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ شاید کسی کو کوس رہی تھیں ، پر کسے؟

اس نے سننا چاہا، پر وہ کوئی نام نہیں لے رہی تھیں۔ آخر کون تھا جسے اس کی اماں، فرشتوں جیسی اماں، بددعا دے رہی تھیں؟

وہ تو دشمن کو بھی دعا دیتی تھیں، کون تھا جو ان کے لیے دشمن سے بڑھ کے تھا؟ اپنی الجھن پر پہ قابو پاتے ہوئے اس نے پھر سے اماں کے بے ربط کوسنوں پہ توجہ دی، تو اس پہ درد کا پہاڑ ٹوٹ گیا، اماں نے ”وہ“ نام لے کے کوسا تھا۔

وہ نام جو اس کی ذات بن چکا تھا، وہ نام جسے اس کا دل کرتا کوئی اور نہ لے، اس کا نام تک وہ کسی اور کے منہ سے نہیں سننا چاہتی تھی اور اس کی ماں اسے بد دعا دے رہی تھیں۔



ایک دم اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا، اماں کو اس کا نام کیسے پتا چلا؟  
وہ مر جاتی پر کبھی کسی کو اس کا نام نا بتاتی، اماں کو کس نے بتایا؟  
اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں سی بج رہی تھیں، کچھ تھا جو اسے ناگہانی کی  
اطلاع دے رہا تھا۔

اچانک لالا کی آواز پہ اس کے وسوسوں کا سلسلہ ٹوٹا یا شاید اس کے خدشوں نے حقیقت کا روپ دھارا تھا۔ وہ بول رہے تھے اور عائدہ کو اپنی سانس رکتی محسوس ہو رہی تھی۔

”اماں وہ بھی بھگت رہا ہے۔“

عائلہ کو اپنا دماغ سن ہو تا محسوس ہوا۔

”ہڈیاں توڑی ہیں۔“

اس کی بند آنکھیں جلنے لگیں۔

”خون میں لت پت۔“

اس کا دل ڈوب سا گیا۔

”بیچ بھی جائے مشکل۔“ عائکہ کو کمرے میں دھماکے ہوتے محسوس ہوئے۔

”ادھر ہی پھینک آئے ہیں۔“





آئیں۔ ایسے ہی کبھی کوئی بھنگی ہوئی اولاد بھی اپنے ضعیف العمر والد یا والدہ کی وہیل چیئر گھسیٹتی نظر آتی جس پہ براجمان سپاٹ چہرے والی شخصیت کو کونے میں نوکر کے حوالے کر کے خود فری وائی فائی کو استعمال کرنا اپنا فرض سمجھ کے موبائل میں گم ہو جاتے۔ اکثر کوئی آرٹسٹ بھی دکھ جاتا جو کسی کونے میں سر جھکائے اپنی کافی پیتے یا پھر کیفے کی گلاس وال کے پار سورج اور سمندر کے ملاپ کے منظر میں گم نظر آتا۔ غرض یہ کہ یہاں کا ماحول نرالا تھا، کوئی کچھ بھی کرے کسی کو کسی سے سروکار نہ تھا، یہی وجہ تھی کہ عائلہ سید کو بھی یہاں کا ماحول پسند آ گیا تھا۔ اسے یہاں آتے ہفتہ ہونے والا تھا۔ پر وہ اس اتوار کے سحر سے نہ نکل پائی تھی، یا یوں کہہ لیں اس کے لفاظی کے سحر سے، تبھی روزانہ اس کیفے آتی، اس کا انتظار کرتی اور چلی جاتی۔ آج پورا ہفتہ ہونے کو تھا۔ پر وہ نہ آیا۔ عائلہ کو تو اس کا نام تک نہ پتا تھا کہ اچانک اپنی ٹیبل پہ کافی رکھتے بیرے کی شکل نے اسے چونکا دیا، یہی تو تھا اس دن جو اس شاندار شخص سے خوش گپیاں لگا رہا تھا۔ عائلہ کی نظر بیرے کی شرٹ پہ سب سے اس کے نام کے بیچ پہ گئی۔

”عمران خان سنو۔“

وہ جو کافی رکھ کے جانے کو مڑا ہی تھا کہ عائلہ کی آواز پہ چونکا۔



”عبداللہ“ عائکہ نے نرمی سے اس کا نام دہرایا تھا۔

”جی باجی! عبداللہ، عبداللہ سکندر۔ پچھلے دو سال سے ہر اتوار کے دن یہاں آتے ہیں اور اسی طرح کسی بہترین کتاب کا خلاصہ دیتے ہیں۔ اکثر لوگ تو یہاں صرف ان کی آواز اور باتیں سننے آتے ہیں۔“

بیرا نہایت پر جوش اور عقیدت مندانہ انداز میں عائکہ سید کو عبداللہ کے بارے میں معلومات دے رہا تھا، جنہیں وہ بڑے اٹھماک سے سن رہی تھی۔

”اچھا سنو! کرتے کیا ہیں تمہارے عبد اللہ صاحب؟“

عائلہ کے مزید کریدنے یہ بیرا پھر سے سادہ سے لہجے میں بولا:

”بہت پڑھے لکھے ہیں جی عبداللہ بھائی، ایم ایس سی کیا ہے۔ بہت خود دار ہیں، اپنے بل بوتے پہ بنایا ہے خود کو، اب بھی ایک نجی کالج میں لیکچرار ہیں اور ساتھ میں ایم فل کر رہے ہیں۔ بہت ذہین بندے ہیں جو بھی ایک دفعہ ان کی باتیں سن لے، ان سے مل لے، اگلی دفعہ ضرور آتا ہے۔“

عائلہ نے پہلے ہی سے خم کھائی ہوئی ابرو کو تھوڑا اور تان کے عمران کے چہرے پہ جھوٹ یا خوشامد کا شائبہ ڈھونڈا، پر ادھر صرف جوش تھا، اس شخص کے لیے محبت تھی عقیدت تھی۔













شخص تھا۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسی انفرادیت تھی کہ وہ کسی سنگِ مرمر کے بت کی طرح دمِ سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے گرد کیا ہو رہا تھا کیا نہیں، اسے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا اس نے غور ہی نہ کیا۔ بس ایک بھاری خوبصورت آواز تھی اور نرم سا لہجہ یا شاید گھنٹیاں تھیں ڈھیروں ننھی منی گھنٹیاں جو اس کے گرد ٹرانس کی سی کیفیت بنائے ہوئے تھیں۔ اس نے اتنی حسین آواز اور اتنا مکمل لب و لہجہ کبھی نہیں سنا تھا۔ اس کے دل نے شدید خواہش کی تھی کہ ایک بار بس ایک بار اچھٹی سی ہی صحیح وہ اس پہ نگاہ تو ڈالے، یہ خواہش وہ لڑکی کر رہی تھی جس کی طرف اُٹھنے والی ہر نظر کو پابند کر دیا جاتا تھا۔

اس کے دل نے گڑگڑا کے اس کی ایک نظر مانگی تھی۔ پر اس کی چمکتی آنکھیں اس پر اٹھتی ہی نہ تھیں۔ اس کے دل نے پھر ضد کی تھی۔ پر وہ اب شاید جانے لگا تھا، لوگوں سے مصافحہ کرتا، وہ مُسکرا مُسکرا کے دادسمیٹ رہا تھا۔ اسے اپنا دل اداس ہوتا محسوس ہوا۔ وہ جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا، تو اس کا دل پھر گڑگڑا۔

”یا اللہ ایک بار بس۔“



پر وہ نہ مڑا نہ اس پہ نگاہ ڈالی اور چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی جیسے پورا کیفے جاگ گیا یا شاید یہ عائکہ سید کے حواس تھے جو بحال ہوئے تھے۔ شعور کی دنیا میں آتے ہی اس کی پہلی نظر ذاکرہ پہ پڑی جو حیران اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ عائکہ نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود متذبذب سی پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گئی۔

یہ تھی عائکہ سید کی عبداللہ سے پہلی اور مختصر ترین ملاقات۔

اس دن سے عائکہ کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی، وہ تھا کہ اس کے دماغ سے جاتا ہی نہ تھا وہ قابض تھا اس کے دل دماغ اور ہوش و حواس پہ۔

آج اگر وہ عمران خان سے اس کا نہ پوچھتی تب بھی اس نے طے کر لیا تھا کہ روز یہاں آکے اس کا انتظار کرے گی۔ ایک ہفتہ تو کیا وہ پوری زندگی اس کیفے میں اس کی ایک جھلک کے انتظار میں گزار دے۔

عائکہ گلاس وال کے پار ساحل پہ سر پٹختے سمندر کی لہروں کو دیکھ رہی تھی۔ آج وہ اکیلی آئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ذاکرہ یا اماں اسے اس طرح عبداللہ کے پیچھے خوار ہوتے دیکھ کوئی غلط مطلب لیں۔ عائکہ کوئی فیری ٹیل میں رہنے والی لڑکی نہ تھی، اسے اچھے سے اندازہ تھا کہ محبت ان کے قبیلے میں مرد عورت دونوں کے





تھا۔ اس کونے والی میز پہ سنگ مرمر کا مجسمہ بنی بیٹھی اپنے دل میں اس کی ایک نظر کی بھیک مانگتی لڑکی سے یک سر بے نیاز۔

عبداللہ کے خاموش ہوتے ہی جیسے پورا کیفے جاگ اُٹھا۔ تالیوں کی گونج نے عائلہ کو بھی احساس دلایا کہ ٹکلی باندھ کے دیکھنے کا کوئی جواز نہیں، ذرا ادھر ادھر بھی دیکھ لو۔ عائلہ نے پلکیں جھکا کے کافی کو دیکھا، تو اسے احساس ہوا وہ ٹھنڈی ہو چکی تھی اور اس میں چچ گھماتا اس کا ہاتھ ابھی تک اسی انداز میں چچ پہ ٹکا تھا۔ اسے اپنی انگلیاں اکڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ اس نے گلاس وال کے پار نگاہ دوڑائی، آسمان پہ لال جامنی شفق کسی حسینہ کے آنچل کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ سورج کی سنہری رنگت، کسی باحیا چہرے کی سُرخ کی طرح لال پڑ گئی تھی۔

عائلہ کو احساس ہوا اسے یہاں کافی دیر ہو چکی تھی۔ یہ عبداللہ کی آواز کا جادو ہی تو تھا جس کے زیر اثر عائلہ سب بھول جاتی تھی۔ اس کے ذہن میں بابا کی آواز گونجی:

”عائلے میرا بچہ! ہماری بیٹیاں مغرب سے پہلے گھر آ جاتی ہیں اور مغرب کے بعد گھر سے باہر قدم نہیں رکھتیں۔“



اس کی برائون آنکھوں پہ الوداع کہتی دھوپ کی شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ عبداللہ کو لگا جیسے وہ برائون آنکھیں پگھل رہی ہوں۔ اسی حسین شام کی طرح پگھل کے گلابی رنگ میں ڈھل رہی ہوں۔ اس کی ناک بہت چھوٹی سی تھی جو شاید ٹکر کی تاب نہ لاتے ہوئے بے حد گلابی ہو رہی تھی۔ اس میں چمکتا ہیرا، سورج کی شعاعیں پڑنے پہ انوکھا جلتارنگ مچا رہا تھا۔ اس کے نیم وا ہونٹ کسی کھلے ہوئے گلابی پھول کی پنکھڑیاں ہوں جیسے۔ اس کی چادر سر سے سرک کے کندھوں پہ جھول گئی تھی۔ چادر کی اوٹ سے اس کے برائون بال اس کے چہرے پہ اڑ کے بکھر رہے تھے۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں کچھ تو تھا جو عبداللہ کو سوچنے پہ مجبور کر رہا تھا۔ کیا تھا وہ؟

ایسی نرمی، ایسی شناسائی جو صرف کسی اپنے کے لیے ہوتی ہے۔ ایسی ستائش جو اس نے آج تک کسی آنکھوں میں اپنے لیے نہ دیکھی تھی یا پھر التجا تھی، نظر نہ پھیرنے کی۔ اس کی آنکھوں کے راز کھوجتا عبداللہ اور اس کی ایک نظر کی بھکارن عائد، بت بنے یونہی جانے کتنی دیر سے کھڑے تھے کہ دور کسی موزن نے فلاح کی دعوت دی تھی۔



عبداللہ کی تجویز کردہ کتاب پڑھنی تھی۔ وہ ان لفظوں کو محسوس کرنا چاہتی تھی جنہیں عبداللہ کی آنکھوں نے چوما تھا۔

یہ عائلہ کا معمول بن گیا تھا، ہر اتوار کو کیفے سے واپسی پہ وہ معید سید کو کوئی کتاب لانے کو کہتی اور پھر پورا ہفتہ اسے پڑھنے میں یوں مگن ہوتی کہ نہ کھانے کی خبر رہتی نہ گھر والوں کو وقت دینے کا خیال۔ اس کی ماں فکر مند تھی کیوں کہ عائلہ کا معمول کبھی اس بری طرح متاثر نہیں ہوا تھا جتنا پچھلے تین مہینوں سے تھا۔ اس نے سب جگہ آنا جانا ہی چھوڑ دیا تھا، بس اتوار کے دن کیفے جاتی، کبھی ذاکرہ کو لے جاتی کبھی چھوڑ جاتی۔ پھر واپس آ کے سارا وقت کمرے میں بند ہو کہ کوئی کتاب پڑھتی رہتی۔ کچھ تھا جو اس کی سادہ سی ماں کے دماغ میں ناگہانی کی خلش جگا رہا تھا۔ انہوں نے معید اور ابراہیم صاحب دونوں سے محتاط لفظوں میں اپنی الجھن کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم صاحب نے اس کا حل یہ نکالا کہ آئندہ عائلہ کیفے گل محمد کے ساتھ جائے گی لیکن واپسی پہ معید یا وہ خود اسے لینے جائیں گے۔ یوں اگر عائلہ کے دل میں چور ہو گا تو وہ خود باہر آجائے گا، جب کہ سکینہ صاحبہ نے اپنی طرف سے ذاکرہ سے بھی پوچھ گچھ کی تھی جسے پہلے دن سے علم تھا کہ اس کی گودی ”آل“ ہو کہ ایک ”امتی“ پہ دل ہار بیٹھی ہے، مگر عائلہ کے مضبوط کردار اور

















کے والدین سے دور کر دیا تھا۔ عبد اللہ کی آواز بھی جب گونجتی تو انسان کا خرِ دے تعلق کہاں رہنے دیتی۔

اس چھ ماہ کے عرصے میں اتنا ضرور ہوا تھا کہ بے ادب عائکہ کو ادب سے شغف ہو گیا تھا۔ اب اکثر وہ عبداللہ کی تجویز کردہ کتابوں کے علاوہ بھی اردو ادب پڑھنے لگی تھی۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ اردو زبان میں بڑے بڑے ماسٹر پیس موجود تھے۔ شہاب نامہ سے لے کر راجہ گدھ، عشق کا عین سے لے کر پیر کامل، پیار کا پہلا شہر سے لے کر سفید گلاب، مصحف سے لے کر ہم جان، خدا اور محبت سے لے کر ایک محبت اور سہمی، اس نے اردو کے کئی شاہکار پڑھے۔ ادب کے بے تاج بادشاہوں کو پڑھا۔ اس بے ادب لڑکی کو عبداللہ کے ادب سے عشق ہو گیا تھا اور ادب نے اس کے بند ذہن کے کئی در واکیے تھے جس کا سہرا عبداللہ کے سر ہی جاتا تھا۔ آج عبداللہ کس کتاب کو موضوع بنائے گا۔ عائکہ سید تجسس میں غلٹی باندھے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

عبداللہ تعارفی کلمات بول چکا، تو اپنے ہاتھ میں کپڑی کتاب کھول کے اس میں سے اپنے پسندیدہ اقتباس پڑھنے لگا۔ کیفیہ یہ پراسرار سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اتنی







تھی۔ دل تھا کہ مسلسل بغاوت پہ مائل تھا اور دماغ اسے اس کا مقام، روایات اور اقدار یاد کرا کے روک رہا تھا۔

ذاکرہ کو یکسر فراموش کیے اس کی نگاہیں اب بھی عبداللہ کے گرد کسی دھال کرتی حسینہ کی طرح، بال کھولے، گول دائروں کی صورت گھوم رہی تھیں۔

ذاکرہ نے ڈرتے ڈرتے اپنی گودی کی نظروں میں دیکھا۔ ہیزل آنکھیں لال ڈوروں میں پگھلتیں نظر آئیں۔ ذاکرہ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ عائلہ کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ضد اور بغاوت کی جیت ہو چکی تھی۔ دماغ، اقدار اور روایات کی تو محبت میں ہمیشہ سے ہار ہوئی ہے، یہ پہلی دفعہ تو نہیں۔ پر ایک سید زادی کی بغاوت، ان کی آنے والی سات پشتوں تک کو ہلا دیتی ہے۔ اس سے پہلے کہ ذاکرہ ہمت باندھتی کچھ کہنے کو، عائلہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور بنا پیچھے دیکھے، عبداللہ کی ٹیبل پہ اس کی سامنے والی کرسی پہ جا بیٹھی۔

ذاکرہ کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

عائلہ سید کی ضدی نظریں اب بھی عبداللہ پہ مرکوز تھیں، پر عبداللہ نے کتاب سے آنکھیں نہ ہٹائیں۔

عائلہ تھوڑا سا کھنکاری۔



انہماک سے گھبرائی ہوئی عائلہ کو دیکھتا عبداللہ ہڑ بڑایا تھا۔ پھر خود پہ قابو پاتے ہوئے ، اگلے ہی لمحے کتاب پہ اپنے ہاتھ جماتا ، اعتماد سے عائلہ کے سوال کا جواب دیا:

”یہ کتاب اس لیے چنی کیوں کہ یہ میری پسندیدہ ترین کتاب ہے بلکہ وہ پہلی کتاب ہے جس نے مجھ جیسے بے ادب کو با ادب بنا دیا۔ میں یہ سوچتا ہوں بلکہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ ناول ”عبداللہ“ کو پڑھنے والا خود کو کبھی عشق کرنے سے نہیں روک سکتا خواہ وہ عشق مجازی ہو یا عشق حقیقی اور میں چاہتا ہوں آج کل کے اس مشینی دور میں بھی لوگ عشق کریں۔ سچا عشق، لازوال عشق۔“

وہ خاموش ہوا تو اپنی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ جمائے کسی سنگِ مرمر کے مجسمے کے مانند ہمہ تن گوش عائلہ نے حرکت کی تھی۔ اب کہ اپنی شہادت کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی کو گھماتے ہوئے وہ بولی:

”میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ بالخصوص یہی سطریں کیوں؟“

اس کا صاف لب و لہجہ عبداللہ کو متاثر کیے بنا نہ رہ سکا۔ چار سے پانچ مقامی زبانیں بولنے والی لڑکی کی اردو حیرت انگیز طور پر نہایت صاف تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ اس بارے میں مزید سوچتا نظریں جھکائے بیٹھی عائلہ نے ہلکا سا کھنکار کے اُسے اپنے سوال کی طرف متوجہ کیا۔











نفق چہرہ لیے اس کا سامان اٹھائے ڈاکرہ گلاس وال سے نیچے عائد ہی کو دیکھ رہی تھی۔

کینے کی سیڑھیوں پہ کھڑا عمران خان بھی ان ہی کو دیکھ رہا تھا۔ عائدہ کو اپنے طرف دیکھتا پا کے جانے کیوں وہ سر جھکا کے اپنا چہرہ چھپا گیا۔

عائلہ کی حیران نگاہیں پھر عبداللہ تک آئی تھیں جو آنکھوں میں محبت کے ہزاروں رنگ سجائے ، اس کے چہرے کو ہی تک رہا تھا۔

عائلہ کی سبھی نظریں اپنے ہاتھ پہ گئیں جو اب بھی عبداللہ کے سنہرے ہاتھ میں موجود ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے گندم کے خوشے پہ گلابی گلاب کا پھول کھل گیا ہو۔

عائلہ چاہتی تھی اسے کہے، میرا ہاتھ چھوڑو مجھے نہ چھو، میں سید زادی ہوں، تم نا محرم ہو۔

عائلہ چاہتی تھی اپنی چادر سر پہ اوڑھے، اس کے بال جو چہرے پہ بکھرے تھے انہیں چھپائے، وہاں سے دور چلی جائے، مگر عائلہ کے پاس بھی تو ویسا ہی دل تھا جیسا ہر عام لڑکی کے پاس ہوتا ہے۔ وہ بھی ہر عام لڑکی کی طرح محبت کا اظہار چاہتی تھی، وہ بھی ہر عام لڑکی کی طرح اس لمحے کی گہرائی میں کھو چکی تھی۔









”میں عائکہ ابراہیم سید ، اپنی تمام تر خاندانی روایات ، قبائلی اقدار ، ذات پات کے ہر فرق ، بچپن سے لگی ہر پابندی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یہ اقرار کرتی ہوں کہ ان چھ مہینوں میں میرادل صرف عبداللہ سکندر کے لیے دھڑکا ہے۔ میری ہر آتی جاتی سانس نے عبداللہ کے نام کی تسبیح کی ہے۔ میری سماعتوں نے ہر پل عبداللہ کی ہی آواز سننے کی دعا کی ہے۔ میں نے ہر فرض اور نفلی عبادات کے بعد عبداللہ سکندر کی ایک نظر کی بھیک مانگی ہے۔ ان چھ مہینوں میں، محبت نے مجھے کب عائکہ سید سے عبداللہ سکندر بنا دیا مجھے خود بھی احساس نہیں مگر ہاں!

”مجھ سے زیادہ محبت عبداللہ سکندر سے اس روئے زمین پہ کوئی نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی نہیں، مگر بھی نہیں۔“

سورج سمندر میں ڈوبنے کو تیار تھا۔ اس کی شعاعیں لال رنگ میں ڈھل چکی تھیں۔ اتنے حسین اور کامل اقرار کی امید صرف اتنے ہی حسین اور کامل چہرے سے کی جاسکتی ہے۔ عبداللہ اس دلکش ڈھلتی شام اور عائکہ کے خوبصورت اقرار کے زیر اثر جانے کتنی دیر یونہی چہرہ موڑے کھڑا رہا۔

عائکہ کی نظریں اس کی چوڑی پیٹھ پر کسی ردِ عمل کے انتظار میں گرھیں تھیں۔

ذکرہ اس پر اثر لمحے کے زیر اثر بت بنی کھڑی تھی۔

عمران خان اب بھی کیفے کی سیڑھیوں پہ کھڑا، دور ہی سے سہی اس لمحے کی نزاکت کو محسوس کر سکتا تھا۔

عائلہ کی آنکھوں سے اب بھی آنسو رواں تھے۔  
عبداللہ دھیرے سے پلٹا۔

دور کھڑی ذاکرہ کے ہاتھ میں عائلہ کا فون پھر سے بجا تھا۔ میر صاحب کی تصویر دیکھ کے، ذاکرہ نے فکر سے لال آنسوؤں سے تر اپنی گودی کے چہرے کو دیکھا جسے اس وقت کچھ یاد نہ تھا، یاد رہا تھا تو صرف عبداللہ۔

روئی روئی آنکھوں والی عائلہ کی چھوٹی سی ناک بے حد لال ہو رہی تھی۔ عبداللہ کے تاثرات جانچتے اس کے چہرے پہ اب بھی دو آنسو بہے تھے۔

عبداللہ نے کالی آنکھوں میں محبت کا جہاں بسائے اس کی شہد جیسی آنکھوں میں جھا نکا اور دھیرے سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اسے رونے سے روکا تھا۔  
عائلہ روتے روتے مسکرا دی۔

عبداللہ نے اپنا ہاتھ دھیرے سے اس کے رخسار پہ رکھا اور نہایت نرمی سے دونوں آنسو چنے تھے۔ لمبی پلکیں جھکی تھیں۔ حیا کی لالی نے رخسار دمکائے تھے۔ جھکی پلکیں پھر سے اٹھی تھیں۔





تھی جب کہ مقابل کی قہر برساتی نگاہیں عائلہ کے چہرے سے ہوتے ہوئے عبد اللہ کے چہرے پہ آئی تھیں۔ بھوری قہر آلود آنکھوں نے سب بھید کھول دیے تھے۔ ہو بہو عائلہ جیسی آنکھیں رکھنے والا وہ شخص یقیناً عائلہ کے والد تھے۔ عبد اللہ کی نظریں احساس جرم سے جھکی تھیں۔

جب کہ قہر برساتی نگاہوں کی تپش اب بھی وہ خود پہ محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے جھکی نظریں اٹھا کہ عائلہ کو دیکھنا چاہا۔

گلابی رنگت والی عائلہ کا رنگ خطرناک حد تک سفید ہو چکا تھا۔ گال پہ تھپڑ کا گلابی جلتا ہوا نشان عبد اللہ کے دل کو کاٹ گیا۔ عائلہ دیوانہ وار عبد اللہ کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں چیخ چیخ کہ عبد اللہ سے الوداع کہہ رہی تھیں۔

عبد اللہ دیکھ رہا تھا، جب جب عائلہ کی سہمی ہوئی نظریں اس کے چہرے سے ہوتے ہوئے میر صاحب کے چہرے پہ جاتیں، اس کا پورا وجود کانپ جاتا۔ میر ابراہیم سید کے چہرے پر بے انتہا غصہ، جلال اور نفرت تھی۔ ان کی آنکھوں میں سرد سی بے حسی تھی جو عبد اللہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پیدا کر رہی تھی۔ ابھی وہ میر ابراہیم سید کے جلال کو پرکھ ہی رہا تھا کہ وہ ایک جھٹکے سے مڑے اور پارکنگ لاٹ میں اپنی گاڑی کے پیچھے کھڑی گاڑز کی گاڑی میں بیٹھے گاڑز کو کسی

























مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔

[www.pakistanipoint.com](http://www.pakistanipoint.com)

تو ہی خوشی ہے، تو ہی سکون میرا  
میں تجھ پہ جاں صدقے واری عبداللہ  
جو مُسکرا دے تو، مجھے دیکھ کے یوں  
تو کیوں نہ تم پہ میں مر جاؤں عبداللہ  
تو ہی سورج چاند، تو ہی تارا میرا  
تو کیوں نہ لے آسمانِ بلائیں تیری عبداللہ  
میری آنکھیں، باتیں، خواب ہو تم  
تم ہی میری ہر ایک سانس عبداللہ  
کہو تو رکھ دوں قدموں میں دل اپنا  
پھر اس کو روند کے امر کر دو عبداللہ  
میں پری ہوں کوہِ قاف کی  
تو شہزادہ پر بتوں کا عبداللہ  
میں تو تیری ہوئی ازلوں سے  
ہے تیری کس میں جان عبداللہ؟  
”مجھ میں...؟“



”مجھ میں ہے اس کی جان ...“

کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ اس پہ وحشت سی طاری تھی۔  
اس کی جان مجھ میں ہے۔



پر میں نے خود ہی تو اس کی زندگی کے بدلے اپنی محبت کا سودا کیا تھا۔  
وہ ہندیانی انداز میں خود سے باتیں کر رہی تھی۔ کبھی خود کو یقین دلاتی تو کبھی خود  
سے یوچھتی۔

کیوں کیا میں نے ایسا؟

اپنی محبت کا مقبرہ بنا کے دفن دیا کیوں ؟

اس کی نظروں کے سامنے دو سال پہلے کے کچھ منظر گھوم گئے۔ عائِلہ نے اپنے ہونٹ بھینے تھے۔

کم زوری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

ہشاش ہشاش نظر آتی ڈاکٹر نے نہایت ہلکے پھلکے انداز میں اس سے کچھ سوال کیے تھے۔





ہوش میں آنے کے دو دن بعد تک مسلسل اماں اور لالا اسپتال آتے رہے۔ وہ آتے  
عائلہ سے بات کرنے کی کوشش کرتے، اسے کچھ کھلانے کی کوشش کرتے، پر  
عائلہ ان سے منہ موڑے چپ چاپ بستر پہ لیٹی رہتی۔  
انہیں اندازہ تھا کہ عائلہ ناراض ہے پر جب اس نے ایک دن اماں کے ساتھ آئی  
ذکرہ سے کہا:

”آئندہ صرف تم ہی آنا کافی ہے۔“

تب لالا اور اماں کو اس کی ناراضی کی انتہا پتا چلی۔

اماں نے اس کی خواہش کے مطابق آنا چھوڑ دیا پر لالا اکثر آتے، باہر ہی سے  
ڈاکٹروں سے بات کر کے چلے جاتے۔ جب کہ ذکرہ روز آتی۔  
عائلہ اس سے بھی منہ موڑ کے لیٹی رہتی اس لیے نہیں کہ وہ ناراض تھی، بلکہ  
ایک سیدزادی ہو کر محبت کرنے کی شرمساری چھپانے کو۔ وہ اکثر سوچتی مجھ سے  
تو ذکرہ اچھی ہے اس کے دامن پر کوئی داغ تو نہیں۔ یہی کمتری کا احساس اسے  
نظریں چرانے پہ مجبور کرتا۔

اچانک دستک کی آواز پہ عائلہ چونکی۔ اس کے بے ربط خیالوں کا سلسلہ ٹوٹا۔  
اگلا بندہ دستک کے بعد تھوڑی دیر رکا اور پھر خود ہی اندر داخل ہو گیا۔





”اور روانگی آج ہی ہے۔ تمہارا سامان گاڑی میں رکھا ہوا ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد تمہاری فلائٹ ہے۔“

وہ خاموش ہوئے تو اتنے عرصے میں پہلی دفعہ عائکہ کچھ بولی۔

”بدلے میں، میں بھی کچھ چاہتی ہوں۔“

”بولو؟“

”مجھے عبداللہ کی زندگی، اس کی خیریت کی ضمانت چاہیے۔ بس!“

اب کہ عائکہ نے لالا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا تھا۔

آج معید نے زندگی میں پہلی دفعہ اپنی بہن کی آنکھوں میں بغاوت دیکھی تھی۔ تبھی میکان کی انداز میں بولا:

”ٹھیک ہے میں ضمانت دیتا ہوں تمہیں۔ کوئی اسے کچھ نہیں کرے گا، پر بدلے

میں تم کبھی اس کا نام اپنے ہونٹوں تک بھی نہ لائو گی۔”

عائلہ کی آنکھیں چمکی تھیں۔

”منظور ہے۔“

اس نے اپنی محبت کی قبر پہ مٹی کا آخری بیلچہ ڈالا تھا۔







”ہاں! میری نظر ہی تو بدلی ہے۔ اب میں آنکھوں سے کہاں دیکھتی ہوں؟“

”اب تو میں محبت سے دیکھتی ہوں۔“ اس کی پلکیں نم ہوئی تھیں۔

اب اونچائی سے اس کے گائوں کی روشنیاں بھی دکھ سکتی تھیں۔

خواجہ ولی بابا کے مزار کا سنہرا گنبد ڈھیروں روشنیوں کے ہالے میں، روزِ روشن کی طرح چمک رہا تھا۔

گاڑی بائے پاس سے اتر کر اونچی نیچی پگڈنڈیوں سے ہوتی، خواجہ بابا کے مزار کے پاس سے گزری۔

عائلہ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

خاموش لب اور نم آنکھوں سے اپنی ہتھیلیوں کو تکتے وہ حیران تھی کہ کیا مانگے۔ اسے یاد تھا بچپن میں اسکول سے آتے جاتے وہ دعا مانگا کرتی۔ گاڑی خواجہ کے مزار کی وسیع و عریض حدود سے دور نکل جاتی، پر تیزی سے دعا مانگتی عائلہ کے لب نہ رکتے اور آج اسی عائلہ کے لب خاموش تھے۔

وہ مانگے بھی تو کیا مانگے؟

”عبداللہ...“























”عائلہ! ایک بات پوچھوں؟“

شانزے کے فکر مند لہجے نے عائلہ کے دماغ میں احتیاط کی گھنٹی بجائی تھی۔

”ہاں پوچھو۔“ زبردستی مسکراتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

”سب ٹھیک ہے نا عائلہ؟ مجھے نہ تم ٹھیک لگ رہی ہو نہ یہ سب۔ تم تو کبھی اکیلے اس حویلی میں یوں نہ رہتی، نہ ہی تمہاری طبیعت ٹھیک لگ رہی ہے مجھے، جب سے آئی ہو اس کمرے میں بیٹھی ہو۔ نہ نکلتی ہو نہ ہنستی ہو، نہ پہلے کی طرح باتیں کرتی ہو، کھانا بھی ماہ پری نے بتایا برائے نام کھاتی ہو، بس تم ہو اور یہ کتابیں ہیں، یہ کمرہ ہے۔ کیوں؟ کیا ہوا ہے؟ تم مجھے تو بتا سکتی ہو۔“

عائلہ نے نظریں جھکا کے تمام تر کوشش سے آنسو پیے تھے۔ پھر اس کی طرف دیکھ کے مصنوعی سا مسکرائی تو آنکھیں چمکی تھیں۔

”نہیں تو ایسا تو کچھ بھی نہیں، تم فضول میں فکر کر رہی ہو۔ اصل میں میری ہی ضد تھی یہاں تمہارے ساتھ آ کے پڑھنے کی تبھی بابا کو مجبور ہو کے مجھے بھیجنا پڑا۔ آپس کی بات یہ ہے کہ اصل میں معید لالا چاہتے تھے کہ میں ان کی دلہن کے ساتھ رہوں تا کہ وہ نالائق جلدی سے پڑھ لکھ جائے اور لالا کی شادی ہو جائے۔“





محتاج نظروں سے اپنے گرد دیکھتی عائلہ کی نظر، حویلی کے درپچوں پہ گئی۔  
درپچے میں کھڑا ہیولا بلا شبہ آگینے سید کا تھا جو انہیں اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتی  
تھیں۔

عائلہ اور شانزے نے تھوڑی دیر بے یقینی سے انہیں دیکھا، پھر آنکھوں ہی آنکھوں  
میں فیصلہ کرتیں، درپچے کی جانب بڑھ گئیں۔

ابھی دونوں درپچے کے قریب پہنچی ہی تھیں کہ آگینے سید ہذیبانی انداز میں ہنسنے  
لگیں۔ شانزے نے خوف زدہ نگاہوں سے عائلہ کو دیکھا۔ عائلہ نے ہمت کرتے  
ہوئے دھیرے سے انہیں پکارا:

”اماں کا کی!“

وہ ہنستے ہنستے چوٹیں، نظریں نیچے زمیں پہ مرکوز تھیں۔ چہرے پہ گزرا وقت دگنا  
ہو کے سلوٹیں چھوڑ گیا تھا۔ تیکھے حسین نقش وحشت میں ڈوبے ہوئے تھے۔  
خوبصورت کالے بال جو کمر تک آتے تھے، روکھے اور بے جان سے چہرے پہ  
بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں چاندی کی آمیزش انہیں مزید پراسرار بنا رہی تھی۔



”ذات نہ دیکھ جھیلے ذات کی کیا اوقات؟ عشق دیکھ، دل دیکھ، روح دیکھ۔ روایات کی زنجیر توڑ عشق کر، عشق کر، بس عشق کر۔ باقی سب چھوڑ، باقی سب مٹی۔ صرف اپنی چاہ دیکھ۔ عشق کو ”چاہ“ بنا، ”لا“ نہ بنا مجھ جیسی ہو جائے گی۔ باقی سب چھوڑ، عشق کر عشق، عشق کر عشق، عشق کر عشق۔“

اب وہ رو رہی تھیں۔ سسکتے ہوئے دہرا رہی تھیں۔ ”عشق کر عشق۔“

سسکیاں آہوں میں بدلیں اور آہیں جانے کب چیخوں میں۔

وہ چیختی ہوئیں دھاڑیں مار مار کے رو رہی تھیں اور بار بار عائلہ کی طرف دیکھ کے کہتیں۔

”عشق کر عشق۔“ درپچے پہ سر پٹختیں اور پھر عائلہ کی طرف دیکھ کے کہتیں:

”عشق کر عشق۔“

عائلہ کو اپنے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑتے محسوس ہوئے۔ ہکا بکا کھڑی شانزے ششدر تھی کہ کیا کرے۔ ان سارے بیٹے سالوں میں جب سے آگینے سید گوشہ نشین ہوئی تھیں، یہ پہلی مرتبہ تھا کہ شانزے نے انہیں دیکھا تھا۔ صدمہ اتنا گہرا تھا کہ وہ خود نہ سنبھل پائی تھی عائلہ کو کیا سنبھالتی۔



اکثر عبد اللہ کا تصور اور آگینے سید کے لفظوں کا تال میل اسے اچھا لگنے لگتا۔ وہ عبد اللہ کو سوچتی تو کانوں میں ان کی آواز گونجتی:

”ذات نہ دیکھ جھلے بس عشق کر عشق۔“

اس کا دل ہر ذات پات کے فرق کو بھلا دیتا۔ نہ بابا یاد آتے ، نہ معید لالا سے کیا وعدہ ، نہ اماں کی تربیت پہ لگنے والی تہمتوں کا خیال آتا ، نہ اپنی زندگی کا۔

اس کا دل بغاوت پہ ہمکنے لگتا۔ وہ سر جھٹکتی ، استغفار پڑھتی ، پر کانوں میں گو نجی آواز خاموش نہ ہوتی۔

”چاہ نہ چھوڑ، مجھ جیسی ہو جائے گی۔“

عائلہ بے ساختہ کانوں پہ ہاتھ رکھ دیتی، آواز مزید گونجتی:

”ذات نہ دیکھ جھلیے، ذات کی کیا اوقات؟“

عائلہ کتاب کھول لیتی۔ کتاب کے سارے لفظ مٹ جاتے ، صرف ایک سطر لکھی دکھائی دیتی:

”تم بھی باغی ہو۔“

وہ کتاب بند کر کے وضو کرنے چلی جاتی۔ آواز اب بھی آتی۔

”دل دیکھ، روح دیکھ، عشق دیکھ۔“















یا شانزے نہیں ہو سکتیں کیوں کہ مقابل کے بال بے حد لمبے اور دھوپ میں سونے کی طرح چمک رہے تھے۔

جب سے وہ لوگ اس حویلی میں منتقل ہوئے تھے اس نے کبھی عائلہ کو نہ دیکھا تھا۔ وہ شانزے کی ہم عمر تھی اور شاہ زین سے دو سال بڑی۔ بچپن میں ساتھ پلے بڑھے تھے، تجسس نے پھر انگریزی لی اور دل اس کا چہرہ دیکھنے کو مچلا۔ شاہ زین نہایت احتیاط سے دبے قدموں چلتا درختوں کی اوٹھ میں ہو گیا۔ اب وہ عائلہ کو دیکھ سکتا تھا گو سامنے سے نہیں...

سفید لباس میں ملبوس، درخت کے تنے پہ سر ٹکائے آنکھیں موندے وہ جانے کیا سوچے مسکرا رہی تھی۔ گلابی رنگ پہ اڑتے سونے جیسے بال اس کے چہرے کو یونانی حسن کی رفق بخش رہے تھے اس کی ناک کا چمکتا نگینہ اور لمبی پلکیں حسن کو کامل کر رہی تھیں۔ دودھیا پیر گلابی پھولوں پہ ٹکے اتنے چمک رہے تھے کہ جیسے پھولوں پہ ہی رکھنے کو تخلیق کیے گئے ہوں اور ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپٹے نور کا ہالہ سا بنا رہے تھے۔

کیا یہ وہی عام سی عائلہ تھی جس کے ساتھ اس کا سارا بچپن گزرا تھا؟ وہ اور معید لالہ کے اسے کتنا ستاتے تھے۔ موقع ملنے پہ وہ بھی شاہ زین کو ایک دو جڑ کے

اپنے بڑے ہونے کا رعب جماتی۔ کچھ تو خاص ہے اس عائلہ میں کچھ نیا۔ اتنا مسحور کن حسن، اتنا کامل منظر۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑی تھی کہ ہوا چلی اور عائلہ پہ پھول برس گئی۔ اب کے پھر سے وہ کھکھلائی اور یونہی آنکھیں موندے بیٹھی رہی۔ کئی پھول اس کے گود میں گرے اور کئی بالوں میں الجھ چکیتھے۔

شاہ زین اس کی ہنسی کے زیرِ اثر بت بنا سانس روکے درختوں کی اوٹھ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ پھر سے ہوا چلے اور چیری کے پھول اس پیاری سی لڑکی کو گدگدائیں، مگر ہوا تھی کہ خڑے دکھانے لگی۔ نہ ہوا چلی نہ وہ کھکھلائی۔ شاہ زین کو خیال آیا کیوں نہ درخت کو ہلکا سا جھٹکے اور اس پہ پھول برس جائیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ وہ درخت کے پاس گیا جس سے ٹیک لگائے عائلہ بیٹھی تھی۔ درخت کی اوٹھ میں کھڑے، اس نے کچھ شاخوں کو پکڑ کے دھیرے سے جھٹکا۔ گلابی پھول عائلہ پہ بکھرے تھے۔ کچھ پھول پیشانی، رخسار اور ہونٹوں کو چھو کے نیچے گرے تھے۔

عائلہ کی ہنسی بے ساختہ تھی۔ موندی آنکھوں سے کھکھلاتی وہ بے حد دلکش لگی تھی۔ شاہ زین کے دل نے اسے مزید مجبور کیا۔ دوبارہ شاخیں جھٹکتے، اس نے عائلہ پہ گلابی پھولوں کی بارش کی تھی۔









”غور سے دیکھو تمہیں چاند میں داغ دکھائی دے رہے ہیں؟ اجلے، گورے، چاند پہ یہ داغ ہی اسے مختلف اور پراسرار حد تک حسین بناتے ہیں۔ اگر چاند پہ داغ نہ ہوتے تو چاند عام سا ہوتا۔ بالکل ویسے جیسے، ہمارے ارد گرد بہت سے خوش شکل، اجلے اور خوش باش لوگ پائے جاتے ہیں، مگر ان میں کچھ بھی پرکشش حد تک مختلف نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اُن کا وجود بے داغ ہوتا ہے۔ عام سا اور کبھی کبھار ہم کسی واجبی انسان میں کچھ بہت پرکشش، بہت مختلف محسوس کرتے ہیں، تو پتا ہے تمہیں وہ کشش کیا ہے؟“

”وہ ان کے وجود کے زخم ہیں۔ ان کی روح پہ لگے داغ ہیں جو انہیں منفرد بناتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے ایک دانشور کا قول ہے کہ دنیا کی سب سے خوبصورت مسکراہٹیں وہ ہیں جو ٹوٹی ہوئی ہوں یعنی جن میں درد کی آمیزش ہو اور درد ہر ایک کا مقدر تو نہیں نامیری جان؟ درد تو اللہ کے چنے ہوئے بندوں کو نصیب ہوتا ہے، جن کے لیے عشق کے در وا کر دیے جاتے ہیں۔ ہر کسی کے سینے پہ زخمی دل کا تمغہ، عشق کی شہادت نہیں دیتا۔ یہ کچھ چنے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ جیسے کہ میں ... جیسے کہ تم۔“

عالمہ نے سرا سیمگی سے ان کے چہرے کو دیکھا اور پھر ہکلاتے ہوئے پوچھ بیٹھی:

”کیا آپ نے بھی عشق... شق۔“

”عشق؟“

”شدید عشق... بے تحاشا۔“

آگینے نے اس کے ادھورے سوال کا خود ہی جواب دے دیا۔

”تو کیا وہ کم ذات تھا؟“

عائکہ نے ڈرتے ڈرتے پھر سے پوچھا۔

”کم ذات؟ کم ذات پہچانتی ہو؟ وہ جو ہوس کو عشق کا پیر ہن پہنائے وہی ہوتے

ہیں کم ذات...“

اور وہ تو اتنا اعلیٰ ظرف تھا کہ میرے سائے کی بھی عزت کرتا تھا۔ وہ کم ذات کیسے

ہو سکتا تھا؟

”کیسے؟“

عائکہ نے شرمندہ ہوتے ہوئے دوبارہ پوچھا:

”وہ میرا مطلب تھا کہ کیا وہ ہم ذات نہ تھا؟“

اب کے آگینے بولی تو لہجہ بیگانہ تھا:

ہم ذات؟



عائلہ نے مزید ہمت کر کے انہیں کریدا۔

جواباً آگینے سید کی ہذیانی ہنسی نے اسے خوف زدہ کر دیا۔

”جب سزائے موت کے دو طریقے سامنے رکھے جائیں۔ پہلی، پوری دنیا کے سامنے سولی پہ لٹکائے جانے کی سزا اور دوسری، اکیلے بند کمرے کے پیچھے روز سولی پہ لٹکنے کی، تم کون سا چنو گی؟ عزت بچا کے بند کمرے کی موت یا سر عام پھانسی؟ میرے سامنے دو ہی راستے رکھے گئے۔ شادی کر کے کسی کی وفا شعار بیوی بننے کی اداکاری۔

یا پھر بند کمرے میں تمام عمر قید تنہائی۔

میں مر کے بھی منافقت کی زندگی نہ چنتی تھی میں نے عمر قید کا انتخاب کیا۔ بند کمرے میں قید ہو گئی۔

اسی بند کمرے میں تو میں نے اسے پایا ہے۔ تمہیں پتا ہے وہ مجھ میں رہتا ہے میرے اندر رہتا ہے۔ مجھ سے باتیں کرتا ہے۔ میرے ساتھ ہنستا ہے روتا ہے، جاگتا سوتا ہے۔ وہ مجھ میں دکھائی دیتا ہے۔ کیا تمہیں بھی دکھ رہا ہے وہ، بتا؟“

”بتاناں۔“

وہ بچوں کی طرح عائلہ کے ہاتھ جھٹک جھٹک کے پوچھ رہی تھیں۔ عائلہ کے پاس ان کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خاموشی سے ان کا نحیف چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ”سنو! اس کی آواز سنو۔ وہ میرے اندر ہے۔ اس کی آواز آرہی ہے تمہیں؟“ وہ بول رہا ہے۔ ”می رقصم“ ہاں!

می رقصم  
سنو...

ٹوٹے پھوٹے لفظ، وحشت زدہ چہرہ، بکھرے بال، سیاہ لباس۔ آج عائلہ کو ان سے خوف نہیں بلکہ ترس آرہا تھا۔ کتنے خوبصورت انسان، زمانے، معاشرے، روایات اور ”لوگ کیا کہیں گے“ کی بھیٹ چڑھ جاتے ہیں۔

کیا روایات اور اصول، انسانی زندگی اور خوشی سے بڑھ کے ہیں؟ اپنے خیالوں میں گم عائلہ چونکی۔ آگینے جانے کب اٹھ کے جا چکی تھیں۔ عائلہ نے ان کی تلاش میں نظر دوڑائی۔

سامنے سفید سنگ مرمر کی روش پہ وہ کچھ گنگناتی، گول دائروں کی صورت گھوم رہی تھیں۔

ایسے کے ان کا ایک ہاتھ ہوا میں معلق تھا، جیسے انہوں نے کوئی رسی تھام رکھی ہو اور دوسرا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔

عائلہ نے کوشش کی کہ سن سکے وہ کیا گنگنا رہی تھیں۔

فارسی کے کچھ میٹھے گھرے لفظ اس کی سماعت تک پہنچے وہ حیران رہ گئی۔  
کیا بند کمرے میں آگینے نے علم حاصل کیا تھا؟

یا ادب پڑھا تھا؟

کیسے شیخ عثمان مروندی کے یہ خوبصورت الفاظ انہیں ازبر تھے؟ اسے یاد تھا انہیں ادب سے کبھی شغف نہ رہا تھا اور اب وہ اشعار گنگنا رہی تھیں۔ کیا ادب کا عشق سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ کسی بھی بے ادب عاشق کو با ادب کر دیتی ہے؟  
وہ گنگنا رہی تھیں اور گول دائروں میں گھوم رہی تھیں۔

نمی دانم کہ آخر چوں دم دیدار می رقصم  
مگر نازم بہ ایں ذوق کہ پیش یار می رقصم  
تو آں قاتل کہ از بہر تماشا خون من ریزی  
من آں بسل کہ زیر خنجر خون خوار می رقصم  
بیا جانان تماشا کن کہ در انبوه جانبازاں

بہ صد سامانِ رسوائی سر بازار می رقصم

می رقصم...

می رقصم...

می رقصم...

می رقصم کہتی ان کی آواز بلند اور گھومنا تیز ہوتا گیا۔ اتنا تیز کے اب عائلہ کو لگنے لگا انہوں نے سچ میں کوئی ان دیکھی رسی تھام رکھی ہے جس کے سہارے وہ اتنا تیز گھوم رہی تھیں۔

دو پٹا کب کا گر چکا تھا۔ لمبے روکھے بکھرے بال چہرہ ڈھانپ رہے تھے۔ ان کے عین اوپر پورے چاند کی روشنی اور پیچھے چاندنی میں نہائی ویران سفید حویلی۔ عائلہ کو یہ سب بہت پر اسرار سا لگا۔

اس کی نظریں سفید سنگِ مرمر پہ تیزی سے حرکت کرتے ان کے پیروں پہ گئیں۔ خوف کی ایک شدید لہر اس کے وجود میں سرایت کر گئی۔ اسے لگا جیسے آگینے کے پیروں کے ساتھ دو اور بھی پیر محو رقص تھے۔ خوف زدہ نگاہیں ان کے وجود پہ گئیں۔ ادھر بھی آگینے سید کے سیاہ پیراہن کے ساتھ کسی کے سفید پیراہن کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی تھی۔











شرمندگی سے اپنی ماں کی آنکھوں میں امید کے بجھتے دیے دیکھ ماہا دوبارہ سے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کمرے سے صحن تک کا فاصلہ بہ مشکل دس قدم تھا۔ کمرے میں بچھی مسہری جس پہ بیٹھی وہ اپنے قریب سوئی ہوئی بارہ سالہ ثنا عرف چھوٹی کے چہرے پر پھیلے اطمینان کو رشک سے دیکھ رہی تھی، امی کی آنسوؤں میں تر دعا بہ آسانی سن سکتی تھی۔

”یا اللہ کرم کر دے۔ اے مولا رحم کر دے۔ وہ میرا واحد سہارا ہے یا اللہ اسے مجھ سے نہ چھین۔ اس گھر کا سائباں اب وہ ہے۔ سکندر کو کھو دیا، یا اللہ مجھ سے میرا بیٹا نہ چھیننا۔ اس کی کوئی تو خبر لا دے مولا۔ میں بہت لاچار ہوں۔ دو یتیم بیٹیوں کا ساتھ ہے مولا، اس سیلاب جیسے شہر میں اسے کہاں ڈھونڈتی پھروں خدایا۔ اس کی حفاظت کر۔ اسے دشمن کے شر سے محفوظ رکھ خدایا۔ میں نے آج تک تیری کسی آزمائش پہ اف تک نہیں کی مشکل سے مشکل وقت ثابت قدمی سے گزارا۔ دس سال کی بیوگی کاٹی، ہر مشکل جھیلی صرف اپنے بڑھاپہ کے اس واحد سہارے کے آسرے مجھ سے میرا شہزادہ نہ چھیننا مولا۔ اس کی خبر لا دے۔“



”کون تھا، اس کی ہی کوئی خبر تھی نا کیسا ہے وہ؟ اور ایکسیڈنٹ؟“

”جی امی اسپتال سے فون تھا۔ بھائی کا معمولی سا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ کچھ ہلکے پھلکے زخم آئے ہیں۔ ابھی دوا کے زیر اثر سو رہے ہیں، جیسے ہی اٹھیں گے انہوں نے کہا وہ ہم سے ان کی بات کرائیں گے۔ ان کا فون بند ہو گیا تھا ورنہ وہ ہمیں پہلے ہی بتا دیتے فون کر کے۔“

انہیں مطمئن کرنے کی کوشش میں ماہا زبردستی مسکرائی بھی تھی۔ ورنہ اس کے دل کا حال بھی امی سے جدا نہ تھا۔

”یا اللہ تیرا شکر ہے، یا مولا تیرا کرم ہے۔ میرے بیٹے کی خبر آگئی۔ بے شک تو سننے والا ہے بے شک تو نے مجھ گناہگار کی سن لی ہے۔ میں تیرا کیسے شکر ادا کروں میرے مولا۔“ نم آنکھوں سے۔

پھر ماہا کو دیکھتے ہوئے بولیں:

”چلو جلدی ورنہ فجر قضا ہو جائے گی اور شکرانے کے نفل بھی تو ادا کرنے ہیں۔“

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔

[www.pakistanipoint.com](http://www.pakistanipoint.com)

اگلے ہی پل دونوں ماں بیٹی ، باہر تخت پہ نماز فجر ادا کر رہی تھیں اور جو ماں ساری رات اس کی خیریت کی دعا کرتے نہ تھکی تھی۔ دوپہر ہونے تک شکرانے کے نفل ادا کرنے کا ارادہ کر چکی تھی۔

ایسی ہی ہوتی ہیں اکلوتے بیٹوں کی مائیں جس طرح بیٹیاں ، باپ کی چہیتی اور آنکھوں کا تارا ہوتی ہیں بالکل ویسے بیٹے ماؤں کے لاڈلے اور کل کائنات ہوتے ہیں اور پھر جن ماؤں کے بیٹے اکلوتے اور ان کے گھر کا واحد سا بچا ہوتے ہیں ، ان کی تو جان ہوتی ہے بیٹوں میں۔

عبداللہ بھی صغریٰ بیگم کی جان اور دونوں چھوٹی بہنوں کی کل کائنات تھا۔

☆...☆...☆

فجر کی اذان ہونے والی تھی۔ سمندر کے نزدیک اور شہر کی رونقوں سے تھوڑا دور واقع ، اس چھوٹی سی جھونپڑی میں ، شاہ آغا فجر کے لیے اُٹھے تھے۔ پیلا بلب جلاتے ہی وہ ننھی سی جھونپڑی ، زرد روشنی میں نہا گئی۔ ایک چارپائی ، ایک صندوق ، زمین پر بچھی بوسیدہ سی چٹائی اور پانی کا ایک مٹکا۔ اتنے تھوڑے سے سامان کے باوجود اس جھونپڑی کا مکین بہت امیر تھا۔



خدا کے قرب کی امارت جو ہر قسم کی امیری ، نام و رتبے اور شہرت سے بڑھ کر ہے۔ انہیں وہ حاصل تھی۔ بھلا جسے اللہ مل جائے اسے اور کسی چیز کی چاہ رہتی ہے ؟

شاہ آغا نے مسجد جانے کی تیاری کی۔ قریب ہی واقع عالی شان سی مسجد تک پہنچنے میں روز تقریباً پندرہ منٹ تو لگ ہی جاتے تھے ، تبھی وہ فجر سے پہلے ہی مسجد کی طرف قدم بڑھا دیا کرتے تھے۔ اذان رستے میں ہو جایا کرتی اور شاہ آغا جب تک پہنچتے جماعت تیار ہوتی۔

اپنی ننھی سی جھونپڑی کا ٹوٹا پھوٹا لکڑی کا دروازہ ، جبراً بند کرتے ، زنجیر چڑھاتے ، وہ مسجد کی طرف چل دیے۔ ان کی چھوٹی سی کٹیا سے کچھ ہی دور شہر کا ایلٹ علاقہ شروع ہو جاتا۔ جہاں سے سمندر کی طرف انتہائی تیز روشنیوں والے قمقمے نسب تھے جن کی بدولت دور دور تک سمندر اور ساحل سمندر دیکھا جاسکتا تھا۔

شاہ آغا نے بھی یونہی چلتے چلتے ، اچھٹی سی نظر سمندر پہ ڈالی ہی تھی کہ انہیں سمندر کے قریب کسی انسانی جسم کا ہیولا سا ، پڑا دکھائی دیا۔

”یا اللہ خیر۔“ کہتے ، وہ تیزی سے سمندر کی جانب بڑھ گئے۔ ضعیف قدم کسی کی مدد کے خیال سے تیز تر ہو گئے۔









وہ ان بزرگ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میں ادھر کیسے پہنچا۔

ان کو بتانا چاہتا تھا کہ اسے تکلیف ہے۔ اسے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے کوئی کسی تیز دھار آلے سے اس کے بدن کے ٹکڑے کر رہا ہو۔

بابا نے اپنی تسبیح مکمل کرتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے، اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے چہرے پہ پھونکا تھا۔

پھر مسکراتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئے:

”اب کیسے ہو بیٹے؟ کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

عبداللہ نے جواب دینے کی کوشش کی، لیکن پیاسے خشک ہونٹ ہلنے سے قاصر تھے۔ اس نے اپنی تمام تر ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا:

”پانی۔“

شاہ آغا نے قریب ہی رکھا پانی کا گلاس اٹھا کہ اسے سہارا دیتے ہوئے اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا عبداللہ پانی پی چکا تو بہ مشکل کہہ پایا:

”مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے بابا۔“

شاہ آغا ایک دم شرمندہ سے ہوئے تھے۔



اپنا درد سے بلبلانا۔

ان مکروہ چہروں سے رحم کی التجا کرنا۔

اور پھر ان کا بے رحمی سے اسے زدوکوب کرنا اور سمندر کنارے پھینک جانا۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھ کے بیٹھا تھا۔

آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھایا تھا، مگر اسے اپنی پروا کہاں تھی۔  
وہ تو کچھ بھی کر کے کسی طرح بھی عائدہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کی خیریت معلوم  
کرنا چاہتا تھا۔

گھومتے سر کو ایک ہاتھ سے دباتا، وہ درد کی شدت سے آنکھیں میچ گیا۔

کچھ چکر آنا کم ہوئے تو اس نے اپنے ہاتھ کو جھٹک کے ڈرپ کی سوئی نکالی۔ خون کی پتلی سی لکیر تیزی سے اس کے ہاتھ سے بہنے لگی۔ اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے، اس نے اپنے پیروں کو ہلایا۔

درد نے سسکی کی مانند اس کے ہونٹوں کو چھوا۔

مگر ایک بار پھر عائلہ کے ریت پہ گھسٹتے وجود کی تلخ یاد ، اس کے ٹوٹتے ارادے مضبوط کر گئی۔



پہلا پیر زمین پہ رکھتے اسے لگا جیسے اس کے پیروں تلے زمین نہیں۔ ڈانواں ڈول سا، اس نے دوسرا پاؤں بھی زمین پہ رکھا۔ کچھ دیر وہیں بیٹھے، خود ہی اپنی ہمت بندھانے کے بعد، اس نے اپنے قدموں پہ کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ اپنے واحد تندرست ہاتھ سے بستر کا سہارا لیتے، وہ کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ تھر تھر کانپتے پیر اسے قدم اٹھانے سے روک رہے تھے اور فکرِ جاناں تھا کہ چلنے پہ مجبور کر رہا تھا۔

اپنا پورا زور لگاتے ہوئے اس نے کانپتے وجود کے ساتھ پہلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ ڈاکٹر سمیت شاہ آغا واپس آچکے تھے اور اب شدید حیرت کے عالم میں اسے اپنے سامنے کھڑا دیکھ رہے تھے۔

ڈاکٹر تیزی سے عبداللہ کی جانب بڑھا:

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

عبداللہ نے پلاسٹر شدہ ہاتھ سے اپنے نزدیک آتے ڈاکٹر کو پیچھے دھکیلا۔

ڈاکٹر جو اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہ تھا، لڑکھڑایا۔ پھر جب تک سنبھلا، عبداللہ بستر کا سہارا چھوڑ تیزی سے قدم بڑھانے کی کوشش میں، بری طرح زمین بوس ہو چکا تھا۔











بیٹے کو گلے سے لگاتے ، اس کے پیٹوں میں جکڑے نحیف وجود کو سہارا دیتے اندر کمرے تک لے آئیں۔ ان کے پیچھے ہی ٹیکسی والے کو کرایہ دیتے شاہ آغا بھی اندر آگئے تھے۔

بھائی کے آنے کی خبر سنتی ماہا، کچن سے تقریباً بھاگتے ہوئے آئی۔

کمرے میں شاہ آغا کی موجودگی نے اسے تھوڑا سا سمٹنے پہ مجبور کیا تھا۔

شاہ آغا سے تو وہ سب بخوبی واقف ہو چکے تھے ، مگر پھر بھی وہ دھان پان سی دبتے قد والی لڑکی لوگوں میں گھلنے ملنے سے کتراتے تھی۔

دھیرے سے ”السلام علیکم“ کہتی ماہا نے نم آنکھوں سے بھائی کے چہرے کو دیکھا۔

بہن کی آنکھوں میں چھپے اندیشے دیکھ وہ زبردستی مسکرایا۔

شاہ آغا نے ماہا کو دوائیں تھما کے ، ڈاکٹر کی ہدایات سمجھائیں اور جانے کی اجازت مانگی۔

”بابا! کھانا تو کھا کے جائیں ، آپ کے اتنے احسانات ہیں مجھ پہ میں ایسے آپ کو جانے نہیں دوں گا۔“

عبداللہ کی نحیف آواز کمرے میں گونجی تھی۔













مہندی کی رسم ادا کی گئی۔ بلوچی، براہوی لوک گیتوں پہ عطن نے سما ہی باندھ دیا۔  
پھر کھانا کھلا تو معید سید کو اندر جانے کا موقع ملا۔

حویلی کا صحن خواتین سے کچپا کچھ بھرا پڑا تھا۔ معید کی جھلک دیکھتے ہی ماہ پری اور  
کچھ خواتین اس کی طرف لپکیں۔

براہوی لوک گانا حویلی کی خاموشی کو چیر رہا تھا۔

”پیٹی نا چادر مبارکباد مرے نے

مبارک باد مرے نے لاڈی لکھ وار مرے نے“...

معید شرماتا ہوا خواتین کے جھرمٹ میں صحن میں رکھے صوفے پہ آکے بیٹھا۔

ماہ پری عجلت میں گئی اور ”اسپندان“ کی دھونی سلگا کے لے آئی۔ اسپندان بلوچستان  
میں ہی پائی جانے والی ایک جڑی بوٹی ہے جس کی دھونی قدیم وقتوں سے نظر بد،  
جادو اور ٹونے سے نجات کے لیے مشہور ہے۔

معید کے لیے یہ سب کافی تھکا دینے والا تھا، مگر کیوں کہ یہی روایت تھی، وہ وہیں  
بیٹھا رہا جب تک اسے دولہا بنا دیکھنے کے ان کے سارے ارمان پورے نہ ہو گئے۔

اسی ویران حویلی کے ایک تنہا کمرے میں، جائے نماز پہ بیٹھی آگینے جو حویلی میں آنے والی خوشیوں کی سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی۔ اس کا خیال تو معید کو بھی نہ آیا تھا۔

اسے احساس تھا کہ اس کے ہونے نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ وہ تو زندہ ہو کہ بھی زندوں میں نہ تھی۔

اس کمرے میں اس کی نوجوانی نے جوانی اور پھر بڑھاپہ کے لبادے اوڑھے تھے، لیکن کبھی کسی نے یہ خیال نہ کیا تھا کہ اتنے برسوں سے وہی دو تین سفید و سیاہ جوڑے پہنتے اور دھوتے ان کا کیا حشر ہو گیا ہو گا۔

اسی شاندار حویلی میں ایک ویران مکین برسوں سے کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہے۔ کسی نے سوچا بھی نہ ہو گا کہ وہ مکین کروڑوں کی جائیداد کی مالک تھی جسے اس کے بھتیجے کی خوشی میں شامل تک نہ کیا گیا تھا بلکہ آج تو اسے بھوکا سونا تھا کہ ماہ پری اسے کھانا دینا بھی بھول گئی تھی۔

اکثر اونچی شاندار عمارتوں کی بنیادیں کچی اور کمزور ہوتی ہیں۔ باہر سے دیکھنے والے ان کی حسرت، اصلیت جانے بغیر کرتے ہیں۔ اگر حویلیوں کی مضبوط دیواروں پر،





پر سکون چہرے کے ساتھ سراپا سماعت بنتی عائلہ مغرب کی اذان کو کسی جذب کی سی کیفیت میں سنے جا رہی تھی۔ جیسے ہی اذان اختتام کے قریب ہوئی، اپنا دوپٹا نماز کے انداز میں لپیٹتی وہ میر صاحب کو شرمندہ کر گئی۔

تو کیا عائلہ اذانِ مغرب سننے وہاں کھڑی تھی؟

کہیں میں اس پہ شک کر کے زیادتی تو نہیں کر رہا؟

میر ابراہیم سید کی پر سوچ نگاہیں خالی ٹیرس پہ نکلی تھیں، جب کہ عائلہ نماز ادا کرنے کمرے میں جا چکی تھی۔

رنگ و بو، روشنیاں اور پھول، چچا ابراہیم سید کے گھر بھی کوئی کم رونق نہ تھی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی شانزے کی مہندی لے کے وہ لوگ یہاں پہنچے تھے۔

خوبصورت شوخ رنگوں کے امتزاج اور گوٹے کی نازک سی کڑھائی والے غرارے

میں ملبوس، شرمائی شرمائی سی شانزے بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ یوں تو ان کے

ہاں رواج تھا کہ دلہن جب سے مایوں بیٹھتی، اپنا چہرہ گھونگھٹ میں چھپائے رکھتی،

مگر عائلہ نے اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا اور اب شرارت سے شانزے کو چھیڑ رہی تھی

-



































ذکرہ اس سے نظریں ملائے بغیر، اس کا دوپٹا سر پہ اوڑھانے لگی۔ عائلہ کسی بت کے مانند کھڑی رہی۔

بلاوجہ ہنستی، کھکھلاتی لڑکیوں نے اسے گھیرا اور اس کے ہاتھ پکڑ کے اسٹیج کی طرف لے جانے لگیں۔ عائلہ نے مڑ کے پیچھے کھڑی ذکرہ کو دیکھا جو اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔

انگوٹھی پہنانے کی رسم کا آغاز ہونا تھا۔ سادہ سیاہ دوپٹا کس کے سر پہ اوڑھے، فق چہرہ لیے سوگوار سی دلہن کو، چچی نے منگنی کی انگوٹھی پہنائی۔ بلائیں لیتی اس پر سے پیسے وارتی چچی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی اسے رخصت کرا کے اپنے ساتھ لے چلیں۔

اب کے علیزے اس کے پاس آئی تھی۔ خوبصورت لال دوپٹا جس پہ بھاری بھر کم کشیدہ کاری نہایت نفاست سے کی گئی تھی، اسے اوڑھائی تھی۔ بت بنی عائلہ کے جذبات اور احساسات بھی شاید پتھر کے ہی ہو گئے تھے۔ تبھی اسے کچھ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا۔

”مبارک ہو سلیمہ بہن، اتنی پیاری سی دلہن آج سے آپ کے شاہ زین کی ہوئی

”۔

یہ کس کی آواز تھی عائلہ نہیں جانتی تھی ، مگر الفاظ کتنے زہریلے تھے یہ ضرور پہچانتی تھی۔ وہ ان الفاظ کا زہریلا ڈنک اپنے دل میں پیوست ہوتا محسوس کر سکتی تھی۔

کیا لڑکیاں اتنی ارزاں ہوتی ہیں کہ کوئی بھی آکے ایک انگوٹھی ان کی انگلی میں پہنا کے اپنا بنا لے ؟ لڑکیوں سے تو اچھی قسمت ریوڑھیوں کی ہے۔ ان کا مالک ، گاہک کو ان کی قیمت کم کرنے نہیں دیتا اور گاہک انہیں خریدنے کے بعد کسی رنگین شیشے میں ڈال کے سجالیتا ہے۔ انہیں پھپھوندی لگنے نہیں دیتا۔ پھپھوندی تو ان لڑکیوں کو اکثر لگ جاتی ہے جنہیں ایک انگوٹھی کے عوض کسی کا بھی بنا دیا جاتا ہے۔

پھپھوندی ؟

ہاں !

یہ پھپھوندی ہی تو تھی جو اس کی ادھوری مہندی لگی انگلی سے لپٹ چکی تھی یا شاید کوئی کیرا جو اس کی انگلی سے لپٹ کر اس کا خون چوس رہا تھا۔ عائلہ کی طرف کسی نے مٹھائی بڑھائی تھی۔ بہت کوشش کے باوجود وہ بالکل چھوٹا سا مٹھائی کا ٹکڑا ہی لے سکی، مگر وہ پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتی تھی کہ اس نے اپنی پوری

زندگی میں اس سے زیادہ کڑوا کچھ نہیں چکھا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسا کوئی سلگتا ہوا انگارہ زبان پہ رکھ دیا ہو۔ وہ اسے تھوکنے چاہتی تھی۔

وہ اپنے سر پہ سچے بھاری بھرکم بوجھ کو اتار کے دور پھینک دینا چاہتی تھی۔ رگڑ رگڑ کے اپنی انگلی دھونا چاہتی تھی جس میں کسی اور کے نام کی ہتھکڑی لگ چکی تھی۔

لیکن اس عالم وحشت میں بھی کچھ تھا جو اسے روک رہا تھا یہ سب کرنے سے۔ شاید اس کے حواس تھے جو اب بھی بجاتھے اس نے بہ مشکل خود پہ قابو پایا تھا کہ اماں اس کے پاس آ کے بیٹھیں۔

”سکینہ بہن اب تو آپ میرے گھر کی رونق بھی اپنے گھر لے آئیں ہیں اب تو ہم سے انتظار نہیں ہوتا۔ اب آپ بھی ہماری بیٹی جلد ہی ہمیں دے دیں۔ میرا شاہ زین تو بچپن سے، جب سے ان کی بات طے ہوئی ہے تب سے صرف عائکہ ہی کے سپنے سجائے بیٹھا ہے۔ اب تو ماشاء اللہ عائکہ کی پڑھائی بھی ختم ہو گئی ہے۔ ہم اب کوئی بہانہ نہیں سنیں گے بس۔“

تیز تیز بولتی چچی جیسے ہی خاموش ہوئی تھیں۔ عائکہ کی تو جیسے دنیا ہی خاموش ہو گئی تھی۔





ایک زندگی سے اکتائے ہوئے انسان کے ساتھ جب دھوکا ہو تو سب ڈھونگ سب جھوٹ ہی لگتا ہے۔

عائلہ کی بھی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ وحشت پہ قابو پانا مشکل تھا۔ بالآخر حواس نے ہار مانی اور وحشت کی جیت ہوئی۔

ایک جھٹکے سے عائلہ نے اپنے سر پہ سجال لال دوپٹا دور پھینکا۔ نوچ کے انگوٹھی اتاری اور مٹھائی کا ٹکڑا تھوکتے ہوئے، ہتھیلی کی پشت سے اپنا منہ صاف کیا۔

وہ وہیں کھڑے ہو کے زور زور سے ہنسنے لگی۔ لال آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور ہونٹوں کو تہقہوں سے فرصت نہ تھی۔

جو جہاں تھا وہیں انگشت بدنداں رہ گیا اور تہقہ لگاتی عائلہ، اب ایک اجنبی قدرے موٹی آواز میں تہقہوں سمیت کہہ رہی تھی۔

”تماشا تمام شد، تماشا تمام شد۔“

صوفیہ پہ بیٹھی سکینہ صاحبہ اس کے اچانک جھٹکے سے تھوڑا سنبھلیں، تو اس کی طرف لپکیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ذاکرہ بھی آگئی۔

”عائلہ... گودی“



”کون؟ وہ ”عبداللہ شاہ غازی“ کے مزار کے متولی شاہ آغا؟ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ بڑا علم ہے ان کے پاس۔ کوئی بتائے انہیں۔“ وہ عائدہ کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے ”شاہ آغا“ سے ملنے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔

☆...☆...☆

عبداللہ ایک معمول کی طرح ہجوم کو چیرتا سیڑھیاں چڑھتا، عبداللہ شاہ غازی کے مزار تک آیا تھا۔ یہ قدیم مزار شہر کی سطح سے کافی اونچائی پہ بنا ہوا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مزار میں کئی تبدیلیاں آئیں لیکن اس کی مشہور سو سیڑھیاں آج بھی اس کی پہچان تھیں۔

دن رات جاگتے رہنے والے شہر کراچی کے باسیوں کا مزار پہ تقریباً چوبیس گھنٹے ہی تانتا بندھا رہتا۔ عبداللہ گزشتہ دو سال سے دوپہر کو یہاں آتا اور رات گئے گھر جاتا۔ شاہ آغا کی سنگت نے اس کی شخصیت پہ کئی مثبت اثرات مرتب کیے تھے۔

قطع دار ڈاڑھی، سادہ سی قمیص شلوار اور کندھوں پہ ڈلا عمامہ، عبداللہ کی شخصیت کو مزید نکھار بخش چکے تھے۔ اسی مزار کے قریب واقع پوش علاقے کی مسجد میں وہ مغرب کی نماز کی امامت بھی کرانے لگا تھا۔ چہرے پہ پھیلی وحشت کی جگہ اب

سکون کا ڈیرا نظر آتا تھا۔ البتہ آنکھوں میں پھیلی ویرانی اب بھی اپنی جگہ قائم تھی

ان دو سالوں میں شاہ آغا نے اپنے علم کے وسیع سمندر سے چند قطرے ہی سہی عبداللہ کو بھی سونپے تھے۔ عبداللہ کو ان کے روحانی علم کا اندازہ تو تب ہی ہو گیا تھا جب وہ عبداللہ کے قلبی سکون کے لیے اسے پانی دم کر کے دیتے تھے۔ وہ پانی پیتے ہی عبداللہ کو اپنے اندر سکون کے ٹھنڈے میٹھے چشمے بہتے محسوس ہوتے۔

لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ شاہ آغا کے علم کا اتنا چرچہ ہو گا۔ وہ تو جب مزار پہ باقاعدگی سے آنے لگا تب اسے علم ہوا۔

ان دو سالوں میں اس نے شاہ آغا کو بہت سے لوگوں کے مشکلات کا حل قرآنی آیات اور سورتوں کے ذریعے نکالتے دیکھا تھا۔ شاہ آغا کوئی پیشہ ور عالم یا عامل نہ تھے۔ وہ تو اس مزار کے متوالی اور خدا کے نیک بندے تھے جو اپنے علم کے مطابق لوگوں کو قرآنی آیات بتاتے جنہیں پڑھنے سے، اللہ پاک اپنا فضل فرماتے اور ان کی مشکلات آسان ہو جاتیں۔

اس مزار پہ اکثر آسیب زدہ لوگوں کو بھی لایا جاتا کہ شاہ آغا کو جن نکلنے میں خاص مہارت حاصل تھی۔ عبداللہ کو شروعات میں تو شاہ آغا اس جگہ بیٹھنے تک کی

اجازت نہ دیتے تھے جہاں وہ جن نکالتے تھے ، لیکن رفتہ رفتہ عبداللہ کا نڈر پن اور اُس کا بڑھتا رجحان دیکھتے ہوئے انہوں نے اسے بیٹھنے کی اجازت دے دی۔  
اب عبداللہ نہ صرف ان کے ساتھ بیٹھنے لگا تھا بلکہ اکثر ان کی مدد بھی کر دیا کرتا ۔ آج بھی اپنی ہی دھن میں گم سیڑھیاں چڑھتا عبداللہ شاہ آغا تک آیا تھا۔  
لوگوں کے جھرمٹ میں گھرے شاہ آغا کی نظر عبداللہ پہ پڑی تو وہیں سے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا جواباً مسکراتے ہوئے عبداللہ نے بھی ہاتھ اٹھا دیا۔  
آج جمعرات کا دن اور عقیدت مندوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ آج بھی سیڑھیوں کے پاس نیچے کونے میں بیٹھا ملنگ ”جمعرات بھری مراد“ کی سدائیں بلند کر رہا تھا۔  
مزار کے اندرونی جانب داخل ہونے کے دو دروازے تھے۔ ایک خواتین کے لیے مختص تھا جب کہ دوسرا مردوں کے لیے۔ دونوں دروازوں سے لوگ اندر جاتے ، فاتحہ پڑھتے ، دعا مانگتے اور نکل آتے۔  
وہیں کھڑے شاہ آغا، ہاتھ میں مور کے پنکھ اٹھائے اُن کے سر جھاڑتے ، بالکل ایسے جیسے ان پہ لگی گناہوں کی گرد جھاڑ کے ان کا اصل مسلمان دیکھنا چاہتے ہوں۔

اکثر کسی کو زار و قطار روتے، استغفار کرتے یا دعا مانگتے دیکھ کر چپکے سے ان کے خالی ہاتھوں میں گلاب کا کوئی پھول تھما دیتے۔

اور اس بابت دریافت کرنے پہ شاہ آغا مسکرا کے کہتے:

”یہ لوگ ان مزاروں پہ ان قبروں سے مانگنے نہیں آتے عبداللہ۔ وہ رب سوہنے سے مانگنے آتے ہیں بس ان مزاروں پہ آ کے اس لیے مانگتے ہیں کہ انہیں یقین ہوتا ہے یہاں مان کا رب انہیں مایوس نہیں کرے گا۔ تمہیں پتا ہی بچے دعا کیا ہے؟ دعا نام ہی کامل یقین کا ہے۔ جیسے ہی اللہ کے بندے کا یقین پختہ ہوا ویسے ہی مالکِ دو جہاں نے کہہ دینا ہے ”کن فیکون۔“ ”ہو جا“ اور پھر وہ ہو کے رہتا ہے، لیکن اکثر لوگوں کی دعائیں یہاں آ کے بھی شرفِ قبولیت نہیں پاتیں، جس کی وجہ اُن کا متزلزل یقین ہوتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ایسے لوگ یہاں سے مایوسی لے کے نکلیں۔ تبھی میں اکثر ان کے ہاتھوں میں پھول رکھ دیتا ہوں۔ ایسے ایک ننھی سی امید ان کے دلوں میں جاگ جاتی ہے کہ شاید یہ ان کے رب کا اشارہ ہے کہ ان کی مراد ضرور پوری ہوگی اور وہ خالی ہاتھ نہ جائیں گے۔ بچے مایوسی کفر ہے، اس نفرت بھرے زمانے میں کسی کو کفر سے بچا کے ننھی سی امید کی کونپل پکڑا دینا گناہ کہاں ہے۔ بس یہ سب رب سوہنے کی مرضی ہے، دیکھ اور سر دھن۔“

عبداللہ انہی کی باتیں یاد کرتا ہوا انہیں ایک زار و قطار روتے بزرگ کے خالی ہاتھوں میں ننھا سا پھول رکھتا دیکھ رہا تھا۔ کیا سچ میں سچا یقین ہی دعا کی قبولیت کا اصل راز ہے؟ اگر ہاں تو آج میں کیوں نہ ہر اندیشہ ہر وسوسا بھلا کے اس کی ایک جھلک مانگ کے دیکھوں؟

آنکھیں بند کیے کھڑے عبداللہ نے اپنے ہاتھ دعا کے لیے بلند کیے تھے۔ اللہ تو بڑا رحیم اور کریم ہے پاک ہے، عالی شان ہے۔ میں تو تیرے سامنے کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں کچھ مانگوں۔ پر یا رب تیرے ہی نیک بندے نے مجھے امید دلائی ہے کہ یقین سے مانگوں تو تو رد نہیں کرتا۔ یا رب میں بہت ہی بیچ انسان ہوں، تجھ سے مایوس بھی ہو گیا تھا۔ یقین سے مانگا بھی نہ تھا، مگر آج جب مانگ رہا ہوں تو شرمندہ ہوں۔ یا رب کریم مجھے اس کی ایک جھلک دکھا دے بس۔ مجھے نہیں پتا کہ کیسے مجھے صرف ایک بار اس کی جھلک دکھا دے یا اللہ۔ مجھے علم ہے کہ میری دعا بھی میری طرح بیچ ہے، میں مانگ رہا ہوں تو کیا، ایک سید زادی کی جھلک۔ پر میرا یقین اٹل ہے آج میری دعا رد نہ ہو گی۔

دعا مکمل کرتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ آنسوؤں سے تر چہرے پہ پھیرے تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں بھی گلاب کی ایک ننھی سی کلی مہک رہی تھی





والی لڑکی کے پیروں کے پاس پڑا تھا۔ عبداللہ کی نظر بے ساختہ اس کے پیروں پہ گئی۔

وہی سنگِ مرمر سے تراشیدہ پیر جو ایک دفعہ اس کے دل کی دہلیز پہ پڑے تھے اور ایسے ثبت ہوئے تھے کہ پھر کبھی اس کے دل کی زمین پہ کسی کے قدموں کے نشان نہ پڑے۔

وہ حیران اس کے پیروں پر سے نظر اٹھاتا، اس کے چہرے کو تکتے لگا۔ کالی چادر سے آدھا چہرہ ڈھکے، حیران جھانکتی شہد رنگ آنکھیں بے شک عائدہ سید کی تھیں۔

عبداللہ کا وجود زلزلوں کے زیرِ اثر تھا۔ اس کا ذہن کسی کند ذہن بچے کی سلیٹ کی طرح خالی تھا۔

عبداللہ اور اس چادر والی لڑکی کو یوں پتھر کا مجسمہ بنے دیکھ شاہ آغا کو بات کچھ سمجھ آنے لگی تھی۔

عبداللہ کچھ سنبھلا اور کچھ سوچنے سمجھنے کی کیفیت میں آیا، تو اپنے رب کے آگے سجدہ شکر بجالانے کے لیے خالی جگہ ڈھونڈنے لگا۔

پتھر کا بت بنی کھڑی عائلہ بھی اب متحرک ہو گئی تھی۔ عبد اللہ ادھر ادھر متلاشی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور عائلہ اسے۔ وہ خوف سے پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھی کہ کہیں عبد اللہ پھر سے اس کی نظروں کے سامنے سے دور نہ ہو جائے۔

عبد اللہ پھر سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اب کے اس کے چہرے پہ سکون کے آثار تھے۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے اس کی آنسو بہاتی شہد رنگ آنکھوں کو دیکھتا رہا ، پھر دھیرے سے جھکا اور اس کے قدموں کے پاس سے وہ ننھی گلاب کی لال کلی اٹھائی اور دھیرے سے اس کی طرف بڑھا دی جسے عائلہ نے خاموشی سے تھام لیا ۔

مزار کے اس اندرونی حصے میں ہر وقت ہجوم رہنے کی وجہ سے دھکم پیل مچی رہتی تھی۔ عائلہ اور عبد اللہ کو بھی کئی دھکے لگے تھے، مگر ان دونوں کے لیے تو وقت جیسے رک سا گیا تھا۔ عائلہ کو پیچھے ہجوم میں پھنسی ڈاکرہ اور سکینہ بیگم کا بھی خیال نہ رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو سانس بھی نہ لیتی ، بس صرف عبد اللہ کو دیکھتی اور وقت تھا رہتا۔

اچانک عائلہ کو کسی نے پیچھے سے زور کا دھکا مارا تھا۔ وہ بے ساختہ پیچھے مڑی، پر اپنے پیچھے کھڑے لوگوں کو خود سے بے نیاز پا کے واپس عبد اللہ کی طرف مڑی،





گھر آ کے عائکہ سیدھا اپنے کمرے میں گئی۔ پانگ کے سرہانے رکھی ”ہاشم ندیم خان کی عبداللہ“ کھولی اور جہاں نظم تہ کر کے رکھی تھی، اسی جگہ وہ ننھی سی کلی رکھ کے کتاب بند کر دی۔

وہ جب سے مزار سے واپس آئی تھی کافی تروتازہ اور ہشاش بشاش نظر آرہی تھی۔ سب اس مثبت تبدیلی سے بے حد خوش تھے۔ اماں جو شاہ بابا سے ملے بنا ہی واپس آگئی تھیں، اب ان سے ملنا اور لازم سمجھنے لگی تھیں۔ ان کا خیال تھا بنا ملے اتنا فرق آیا تھا، تو مل کے علاج کرا کے تو عالمہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔

اب وہ خود ہی عائِلہ کو مزار پہ لے جایا کرتیں۔ عائِلہ ہجوم کا بہانہ کر کے اکثر آگے رہ جاتی اور اپنے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے، اترتے عبد اللہ سے باتیں کر لیتی۔

جب عشق کا جادو سر چڑھ کے بولنے لگتا ہے تو رنگ تو چڑھتا ہے۔ عالمہ پہ بھی آہستہ آہستہ چڑھانا رسائی کا کالا رنگ اترنے لگا اور اس کی جگہ محبت کا گلابی رنگ دکنے لگا تھا۔ ہجر جب زیست میں بدلتی ہے تو آپ ہی اعلان کرتی ہے بس یہ سننے والے کی سماعت پہ منحصر ہوتا ہے کہ وہ سنے یا نہیں۔

عائلہ سے بے پناہ محبت کرنے والی اس کی سادہ سی ماں اس سب کو مزار کی کرامات سمجھ رہی تھیں۔ لالا اور شانزے بھی اس تبدیلی سے بے حد خوش تھے۔ ذاکرہ کو اس دفعہ بھی سب خبر تھی، مگر اس مرتبہ بھی وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے، اندھی بنی ہوئی تھی۔

ایک میر ابراہیم سید تھے جنہیں عائلہ میں اتنی بڑی تبدیلیاں، خوش کرنے کے بجائے متفکر کیے ہوئے تھیں۔ شک تھا کہ ان کا جینا محال کیے ہوئے تھا۔ وہ لاکھ کوشش کرتے، مگر ان کا دماغ نہ مانتا کہ صرف مزار پہ آنے جانے سے عائلہ اتنی جلدی زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔ اب تو وہ شاہ زین کے ذکر پہ بھی برا نہ مناتی۔ منگنی کی انگوٹھی بھی خود ہی پہن لی تھی اور اب اس کے مغرب میں وہ خضوع و خشوع بھی نہ تھا۔ اکثر شانزے کے ساتھ ہنستی کھکھلاتی نظر آتی اور یہ سب باتیں میر صاحب کو باور کرا رہی تھیں کہ کچھ تو گڑ بڑ ہے۔ تبھی انھوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب خود ہی خبر لیں گے آخر یہ ماجرا کیا ہے۔

آج پھر جمعرات کا دن تھا۔ ان لوگوں نے آج پھر مزار کا رخ کیا تھا۔ سکینہ صاحبہ اور ذاکرہ کے پیچھے پیچھے چلتی عائلہ نے قدم سست کیے تھے۔ لوگ اس سے آگے بڑھتے گئے، اس کے اور سکینہ صاحبہ کے درمیان ہجوم اور فاصلہ

بڑھتا گیا۔ یہ عام سی بات تھی۔ انہیں لگا ہجوم کی وجہ سے ایسا ہے۔ ہمیشہ کی طرح عائلہ اوپر آجائے گی۔

سست روی سے سیڑھیاں چڑھتے عبداللہ نے جب دیکھا عائلہ پیچھے رہ گئی ہے، تو تیز تیز زینے سر کرتا اُس کے پیچھے پہنچا تھا۔  
”کیسی ہیں آپ؟“

عبداللہ کی دھیمی آواز عائلہ کے کانوں میں رس گھول گئی۔ وہ مُسکرائی۔  
”ٹھیک ہوں اور آپ؟“

عبداللہ بھی مُسکرایا:

”بالکل ٹھیک۔“

کچھ لمحے ان کے بیچ خاموشی سے گزر گئے۔ وہ عائلہ کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھتا رہا کہ اس کی نظر ریلنگ پہ رکھے عائلہ کے ہاتھ پہ گئی۔ جہاں اس کی منگنی کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ عبداللہ کے قدم وہیں تھم گئے۔

دو تین زینے، اکیلے ہی سر کرتی عائلہ کو اس کے قدموں کی چاپ نہ سنائی دی تو، وہ مڑی۔ خود سے فاصلے پہ کھڑے عبداللہ کے فق چہرے کو دیکھ وہ اس کے قریب آئی اور حیرت سے پوچھا:



”کیا ہوا؟“

عبداللہ کی آنکھوں میں بے یقینی کی چھب صاف دیکھی جاسکتی تھی۔

”کیا آپ کی منگنی ہوگئی ہے؟“

اس کے اس طرح سے پوچھنے پہ عائلہ جس نے ہلکے گلابی رنگ کی چادر سے اپنے آدھے چہرے کو ڈھکا ہوا تھا۔ چادر کا کونہ چھوڑ دیا۔ اس پورے عرصے میں آج عبداللہ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ مبہوت سا اسے دیکھ جا رہا تھا۔ اسی اثنا میں عائلہ سید نے اپنی انگلی سے شاہ زین کے نام کی انگوٹھی، جس کے ارد گرد دو مزید انگوٹھیاں بھی تھیں، اتار لیں۔

یہ ایک اچھے خاصے بڑے اور قیمتی ہیرے سے آراستہ، نہایت ہی دلکش انگوٹھی تھی جس کے اطراف میں دو مزید پتلی پتلی، ہیروں سے آراستہ انگوٹھیاں تھیں۔ جنہیں ”گارڈ رنگز“ یعنی پہرے دار انگوٹھیاں کہا جاتا تھا۔

عائلہ کی ہتھیلی پہ تینوں انگوٹھیاں اور چہرے پہ عبداللہ کی نظریں جگمگا رہی تھیں۔ آج مدت بعد عائلہ کے چہرے پہ شرارت کا رقص صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ اس نے مٹھی بند کی اور اپنی پوری طاقت سے انگوٹھیاں اونچائی سے نیچے کی طرف پھینک دی۔









ان کی دھیمی آواز بہ غور سنتی عائلہ کی لال آنکھوں میں آنسو تھے۔ اب کے اس نے قدرے بلند آواز میں کہا:

”میں آسیب زدہ نہیں ہوں سنا آپ نے۔ اس دفعہ میں بابا کو اپنا عبد اللہ چھیننے نہیں دوں گی وہ میرا ہے سمجھیں۔“

تیز تیز آواز میں بولتی عائلہ بری طرح ہانپنے لگی تھی۔ ہانپتے ہانپتے وہ ہنسنے لگی۔ فلک شگاف قہقہے قدرے اونچے اور بھاری آواز میں تھے۔ ہنستے ہنستے وہ ایک پل کو رکی اور اپنی لال آنکھیں سکینہ صاحبہ پہ گاڑتے ہوئے، تقریباً مردانہ آواز میں بولی:

”آسیب زدہ؟ ہاں ہوں میں آسیب زدہ۔ وہ رہتا ہے میرے اندر ہر پل ہر لمحہ۔ میں اسی کی ہوں۔ کیا کر لو گے تم سب؟ بولو؟ نکال سکتے ہو اسے مجھ سے؟ لو نکالو... نکال کے دکھا دو۔“

اپنے دونوں بازو سکینہ صاحبہ کے سامنے پھیلاتے ہوئے، عائلہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اگلے ہی پل وہ پھر سے قہقہے لگانے لگی اور انہی قہقہوں کے بیچ، وہ بے ہوش ہو کے گر پڑی۔



”میں سمجھتا ہوں میری بہن کہ آپ مجھ سے بہت سی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں، لیکن میں معذرت چاہتا ہوں آپ کی بیٹی پہ کوئی آسیب نہیں۔ یہ ایک ذہنی بیماری کا شکار ہیں اور اس کی وجہ کوئی اور نہیں عشق ہے۔ عشق ہی ہے جس نے اس معصوم لڑکی کو آپ سب کے سامنے مجرم بنا کے اکیلا کر دیا ہے۔ یہ اکیلا پن ہی ہے جس نے اسے خود میں ہی محبوب کو بسانے پہ مجبور کر دیا۔ ان کی شخصیت بری طرح سے متاثر ہو چکی ہے۔ یہ خود میں کسی اور کا بسیرا سمجھتی ہیں۔ سائنس اسے ”ملٹی پل پرسنلٹی ڈس آرڈر“ کا نام دیتی ہے جب کہ عرف عام میں اسے ”عشقِ نامراد“ کہتے ہیں۔ یہ عشق ہی انسان کو سکھاتا ہے کہ جس سے عشق کروا سے اپنا لو۔ اپنا آپ اس کے سانچے میں ڈھال لو۔ اتنی محبت کرو کہ تم تم نہ رہو وہ بن جاؤ۔“

سکینہ صاحبہ کی تحیر سے کھلی آنکھوں میں اب فکر کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔  
 ”بابا اس کا کوئی علاج تو ہو گا؟ کوئی وظیفہ؟ کوئی دوا؟ کوئی تعویذ؟“

بابا دکھ سے مسکرائے اور جواب دیا:

”لا علاج“...







”میں بھی کیا کروں امی۔ میڈم روز فیس کے لیے میری بے عزتی کرتی ہیں۔ آج تو انہوں نے کہہ دیا کہ اگر اگلے ہفتے تک فیس جمع نہ کرائی تو وہ مجھے کلاس میں بیٹھنے نہیں دیں گی۔“

ثنا کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے صغریٰ بیگم کے دوپٹے میں جذب ہو رہے تھے۔ اکلوتے بیٹے کی گمشدگی نے تو صغریٰ بیگم کو جیسے دیمک کی طرح چاٹ ڈالا تھا۔ وہ ان کچھ ہی دنوں میں صدیوں کی بیمار لگ رہی تھیں۔

ماہا جو پہلے ہی گھر پہ ٹیوشنز پڑھانے لگ گئی تھی اب ساتھ والی ہائوسنگ سوسائٹی میں واقع بیوٹی پارلر میں ریسپشنسٹ کی جاب کرے گی جو بات اتنے دنوں سے ماہا نہ منوا سکی، وہ بات پہلی مجبوری اور ثنا کے آنسوؤں نے منوا دی تھی۔

یہی تو ہے معاشرے کا المیہ، جہاں باہر کام کرنے والی عورت کو برا، شوق سے کہا جاتا ہے، لیکن اس کے گھر سے باہر قدم نکالنے کی وجہ نہ دریافت کی جاتی ہے، نہ اُس کا کوئی سدباب کیا جاتا ہے۔

کل جب بھائی کی لاڈلی بہن ماہا پہلی بار گھر کی دہلیز پار کرے گی، تو یہ دہلیز بین کرتے ہوئے اس کے قدم روکنے کی کوشش کرے گی، مگر جن گھروں کے واحد سائبان یوں لاپتا ہو جاتے ہیں اور وہاں افلاس کے ڈیرے پڑ جاتے ہیں، تو وہیں ہی

ماہا جیسی بہنیں گھر سے باہر قدم نکالتی ہیں۔ اپنے گھر کا بیٹا بننے کی کوشش کرتی ہیں

کیا ہی اچھا ہو کہ معاشرہ سفید پوش لوگوں کی سفید چادر سے سر ڈھانپی ہوئی بہنوں ، بیٹیوں کو بھی عزت کی روٹی ، عزت سے کمانے کا حق دے دے اور ان کی کردار کشی کی بجائے ان کے عزت کی حفاظت کرے مگر معاشرہ عزت کی بات صرف تب کرتا ہے جب کسی کی کردار کشی کرنا ہوتی ہے۔ کبھی لاپتا نوجوانوں کے پسماندگان ، ان کی بیٹیوں ، ان کی بہنوں کی فکر کوئی نہیں کرتا۔ تھانوں کورٹ کچھریوں کے دھکے کھاتے، ان کی ساری جمع پونجی ختم ہو جاتی ہے، مگر گمشدہ کی کوئی خبر نہ آنا ہوتی ہے نہ آتی ہے۔ ہاں آتی ہے تو کورٹ کی نئی تاریخ آجاتی ہے

آج بھی ملک کے سینکڑوں تھانوں میں ہزاروں کیس درج ہیں جو لاپتا افراد کی تلاش چاہتے ہیں مگر ان کے ورثا یہ نہیں جانتے کہ اکثر لاپتا وہی ہوتے ہیں جو کسی اثر و رسوخ رکھنے والی شخصیت کے زیر عتاب آتے ہیں یا جو کسی اندھی گولی کا نشانہ بنتے ہیں۔

بنگم جہاندیدہ خاتون تھیں کہیں نہ کہیں انہیں اندازہ تھا کہ عبد اللہ کا واپس آنا اب کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

☆...☆...☆

پیاس کی شدت سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ ہونٹوں کو بار بار تر کرتے، اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے اور آنکھوں پہ بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ جانے کون سی جگہ تھی، مگر تھی یقیناً کراچی سے باہر کی کوئی جگہ کیوں کہ یہاں پہنچنے تک انہیں اچھا خاصا وقت لگا تھا۔ رستے میں دو دفعہ تو عبد اللہ کی آنکھ بھی لگی تھی۔

میر صاحب کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے، عبد اللہ مزار کی پارکنگ میں آیا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے پہ اُسے میر صاحب اور اُن کے پیچھے گارڈز کی فوج نظر نہ آئی، تو وہ پلٹا۔ اُس کے پلٹتے ہی کسی نے اُس کی پشت میں بندوق چھوئی۔

”خبردار اگر اپنی جگہ سے ہلے تو گولی مار دوں گا۔“

عبد اللہ نے بے ساختہ اپنے دونوں ہاتھ اوپر کیے تھے۔ اتنے میں ایک اور بندوق کی چھن اسے دوسری طرف اپنی پیٹھ پہ محسوس ہوئی تھی۔ ابھی وہ یہ ماجرا سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ تیسرا بندہ آیا اور اس نے عبد اللہ کے ہاتھ پیچھے کی طرف

باندھے تھے۔ اب وہ اس کی آنکھوں پہ پٹی باندھ رہا تھا کہ زن سے ان کے پاس آ کے رکتی مرسدیز میں بیٹھے میر صاحب پہ اس کی نظر پڑی تھی اور سارا ماجرہ ا سے سمجھ آ گیا تھا۔

اب اسے گاڑی میں ڈال کہ یہاں لایا گیا تھا۔ یہ کوئی اندھیرا کمرہ تھا جس کے دبیز غالیچے کی نرمی وہ محسوس کر سکتا تھا، مگر اسے پیاس لگی تھی بہت زیادہ پیاس۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ ان پہ زبان پھیرتا وہ ان کی سختی محسوس کر سکتا تھا۔ ”کوئی ہے مجھے پیاس لگی ہے۔“

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز اس نے سنی۔ ساتھ ہی کمرے میں روشنی ہوئی۔ آنکھوں پہ بندھی پٹی کے کناروں سے روشنی اسے دکھی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا کسی کو فون ملا رہا تھا۔ پھر کسی مقامی زبان میں کچھ پوچھ کے فون بند کر دیا۔

”تمہیں پانی دینے کا حکم نہیں، شور مت مچانا ورنہ... تمہیں پتا ہے۔“  
عبداللہ خاموشی سے ڈھے گیا۔ اوہ خدا یا یہ ہم نے کیا کر دیا۔ اس نے سوچا۔ پتا نہیں  
عائلہ کس حال میں ہو گی، امی اور بہنیں؟

کاش میں ایک بار ان کے بارے میں سوچتا، مگر میں تو اندھا ہو گیا تھا۔ شاہ بابا نے کتنی دفعہ منع کیا مجھے، سمجھایا، سختی سے ڈانٹا، مگر مجھے تو صرف عائدہ سے مطلب تھا۔ اب جو ہو گا اُس کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ اپنے خیالوں میں گم جانے کتنی دیر ہو چکی تھی، کہ کمرے میں جیسے بھونچال سا آگیا۔ تیزی سے تالا کھولتے زور زور سے اپنی زبان بولتے، دو یا شاید اس سے بھی زیادہ لوگ تھے جو اسے لینے آئے تھے۔

پیاس اور بھوک کی شدت سے وہ کھڑا بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر لے جایا گیا۔ باہر لے جا کے اسے کھڑا کر دیا گیا۔

دور دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ کتنی دیر یونہی کھڑا رہا کہ میر صاحب کی گرج دار آواز میں کچھ کہنے پہ اس کی آنکھوں پہ بندھی پٹی اتار لی گئی۔

”لڑکے ہم نے تمہیں ایک موقع دیا، مگر تم نے اسے ضائع کر دیا۔ تمہیں تمہارا قصور پتا ہے تبھی ہم دہرانا نہیں چاہتے۔ آنکھوں پہ بندھی پٹی اس لیے ہٹائی ہے تاکہ تم دیکھ سکو، ہمارا یہ عالی شان فارم ہائوس اور اندازہ لگا سکو کہ کیا تمہاری اوقات تھی میری بیٹی سے محبت کرنے کی؟“

عبداللہ جو ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ ایک پل کو گھوما اور اپنے گرد پھیلے اس شان دار لان، سوئمنگ پول اور عمارت کو دیکھا، پھر گویا ہوا:

”بے شک میری اوقات نہ تھی، لیکن محبت تو آپ کی بیٹی نے بھی کی تھی۔ اس نے میری اوقات کیوں نہ دیکھی؟“

عبداللہ کے جواب پہ وہ مزید برہم ہوئے:

”نہ کہو اسے میری بیٹی۔ اسے تو میں بعد میں دیکھوں گا۔ تم میں اتنی اکڑ کس بات کی ہے؟ جانتے نہیں کس کے سامنے کھڑے ہو؟“ میرابراہیم سید ”کے۔ میرا تو نام بھی تمہارے دو کمروں کے تعفن زدہ کوارٹر سے بڑا ہے۔“

ان کے چہرے کی طنزیہ مسکراہٹ نے عبداللہ کے تن بدن میں آگ لگا دی۔

”میرا تو ایمان یہ کہتا ہے کہ اللہ کا نام سب سے بڑا ہے اور وہ ہی ہر چیز پہ قادر ہے۔ آپ تو سید ہیں، میرا خیال تھا آپ کو مجھ سے زیادہ علم ہو گا۔“

عبداللہ کی بات پہ میر صاحب آگ بگولا ہو گئے۔

”بہت ہو گئی باتیں، چلو کلمہ پڑھو نہیں تو پیر پکڑ لو۔ شاید معافی مل جائے۔“





مگر انہیں کیا خبر محبت کہاں مرقی ہے۔ عبداللہ بہادروں کی طرح سینہ تانے کھڑا رہا۔

”میں آج آپ کو زبان دیتا ہوں کہ میں مر بھی جاؤں میرا عشق زندہ رہے گا۔ میں عائلہ کے اندر آسوں گا۔ اس کو اپنا بنا لوں گا، اس کی ہر چاہ لا میں ڈھل جائے گی۔ وہ عشق لا کہتی، ساری زندگی میری بنی رہے گی۔ آپ جو بھی کر لیں، ہمارا عشق نہیں مرے گا۔ کبھی نہیں مرے گا۔“

گولی کی گرج نے عبداللہ کو چپ کرایا تھا۔

گولی اس کے سینے کو چیرتے ہوئے اس کے دل ، اس کے قیمتی دل کے پار ہوئی تھی۔

اس کا دل جس کی دھڑکن سننے کی خواہش اکثر عالمہ کو بے چین کیے رکھتی تھی۔  
اب دھڑکنا بھول گیا تھا۔

عبداللہ کھڑے قد کے ساتھ زمین پہ آگرا۔ اس کے ہونٹوں پہ اب کلمہ حق جاری تھا۔ وہ تڑپتا رہا اور کوئی تب تک اس کے قریب نہ آیا جب تک وہ بے سدھ نہ ہو گیا۔





میر صاحب اس کی باتیں ان سنی کرتے اندر جانا چاہتے تھے۔ وہ ان کے پیروں سے لپٹ گئی۔

”بتائیں بابا جواب دیں۔ کہاں ہے میرا عبداللہ؟ کیا کیا آپ نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ آپ کو قرآن کا واسطہ، پلیز اس دفعہ ہمیں معاف کر دیں۔ آج کے بعد میں مر جاؤں گی، مگر اپنے کمرے تک سے باہر نہ نکلوں گی، بس آج اسے چھوڑ دیں۔ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں، مگر اسے جانے دیں۔ آپ کو میری چادر کا واسطہ، بابا پلیز۔“

میر صاحب نے جھٹک کے اسے اپنے پیروں سے پرے کیا۔  
”مار ڈالا میں نے اسے۔ اس کے دل کو۔ اس کے عشق کو اس کے غرور کو۔ عبرت بنا ڈالا میں نے اسے تاکہ پھر کبھی کوئی کسی سیدزادی سے عشق کرنے کا سوچے بھی نہ۔ پھر کوئی عشق نہ کرے، عشق کا نام بھی نہ لے۔ سمجھی تم۔“  
عائدہ سکتے کی کیفیت میں وہیں بیٹھی رہ گئی۔

اس کی سفید چادر پہ پیر رکھتے، میر صاحب کے قدموں کی دھک دور ہوتی چلی گئی۔



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔

[www.pakistanipoint.com](http://www.pakistanipoint.com)

اس کا سفید لباس، پورے چاند کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ گول گول گھومتی وہ گنگنا رہی تھی۔

”عشق من نہ مرد و زندہ شد، بگو عشق لا  
یار من مرد،

مرد و از من شد، بگو عشق لا  
صحرائے دل ام سیراب شد، آتش چشم ام بخ شد  
ایتز کہ ”چاہ“ من ”لا“ شد، زندگی من تمام شد  
بخدا تمام شد

عشق لا شد

عشق لا شد

اس کی آواز کا سوز اور دیوانہ پن ذاکرہ کو حیران کیے جا رہا تھا کہ اسے گول گول گھومتی عائلہ میں عبد اللہ کی جھلک دکھی۔ اسے ایسا لگا کہ عائلہ کے ساتھ ساتھ عبد اللہ بھی گول دائروں میں گھوم رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں عبد اللہ کے ہاتھ تھے، پیروں کے ساتھ ساتھ عبد اللہ کے پیر اور چہرے میں عبد اللہ کا چہرہ۔



آج اسے عائِلہ میں آگینے بھی دیکھی تھی اور عائِلہ ، آگینے بے شک جتنے نام بدل لو ، کردار تو ایک ہی ہے۔ عشق کو لا بنانے والوں کا انجام ایک ہی ہے۔ عشق جب تک ہے ، عشق کرنے والے کے لیے درد ہے، مگر جیسے ہی عشق کی چاہ ختم ہو جاتی ہے، زندگی سے جڑی ہر خواہش ختم ہو جاتی ہے۔ ایک بے حسی سی ہر سو چھا جاتی ہے، پھر کسی چیز سے فرق ہی نہیں پڑتا۔ ایسے لوگ رہیں نہ رہیں بات ایک ہی ہے۔ خواہ عائِلہ ہو یا آگینے آج یا کل ہر کوئی انہیں بھلا دے گا، نہ بھلا پائے گا، تو ان کے عشق کو۔ ”عشق لا“ کو۔۔۔

”بہت مبارک ہو آپ کو سکینہ بہن۔ اللہ پاک مبارک کرے۔“

اپنی ہی سوچوں میں گم سکینہ صاحبہ جبراً مُسکراتے ہوئے مقابل کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

کھوئی کھوئی سی سکینہ سید جانے کب سے اس الگ تھلگ سے صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ انہیں ارد گرد کی خبر ہی کہاں تھی۔ وہ تو اپنی ہی فکروں میں گم تھیں۔

آج اس ہولناک واقعے کو کافی دن گزر گئے تھے، مگر عائِلہ کی طبیعت تھی کہ سنبھل ہی نہیں پار ہی تھی۔ اسے جیسے ہی ہوش آتا ، وہ چیخنے چلانے لگتی۔ بخار تھا کہ کم ہونے کا نام نہ لے رہا تھا۔









سکینہ صاحبہ نے آنسوؤں کی دھند کے پار ادھورے چاند کو دیکھا۔ چاند نے انہیں دلاسا دیتے سرگوشی کی:

”نصیب کا لکھا نہیں مٹا اور اس کے نصیب میں عشق تھا بس! عشق صرف عشق ، بے تحاشا عشق، چاہ کی عشق، لا کی عشق، عشق ہی عشق ... بس عشق ہی عشق۔“  
ان کے لبوں نے دھیرے سے سرگوشی کی تھی ”الوداع عالمے الوداع“ اور ممنا نے ہار کے اپنی بیٹی ”عشق لا“ کو سوپ دی۔

